معاصر ادبی روایت کا مطالعہ: ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی و تنقیدی جہات کا تجزیہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

عارفہ طاہر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۱ء

معاصر ادبی روایت کا مطالعہ: ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی و تنقیدی جہات کا تجزیہ

مقالہ نگار:

عارفہ طاہر

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: معاصر ادبی روایت کا مطالعہ :ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی وتنقیدی جہات کا تجزیہ

پیش کار: عارفہ طاہر　　　رجسٹریشن نمبر:1736/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان وادب اردو

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز ________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی ________________

ڈایریکٹر جنرل

تاریخ: ________________

اقرار نامہ

میں، عارفہ طاہر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

عارفہ طاہر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۱

فہرست ابواب

ABSTRACT

The topic my thesis addresses the study of contemporary literature; the study and analysis of the writings of Dr.Ali Yasir. In contemporary literature poets and writers have taken into account the loneliness of the modern man and the tragedies of life, the ever-changing meanings of life and death, the feelings of a meaningless life, the advantages and disadvantages of the mechanical life and so on.

Doctor Ali Yasir has shown his skills in portraying the changes in anecdotes of the modern world .He made a noticeable place among the young writers. He contributed in an energizing way to the modern literature. This thesis includes all his published and unpublished work. The published books of Ali yasir namely "Irada" Ghazal btaye gi" "urdu ghazal mai tasaver-e- fana –o-baqa ."Quliyat Manzoor Arif : tehqeeq-o-tadween are included in this thesis. In addition to this; his scripts, poetry from different magazines, essays and translations are also included. Kaleem-ud-din Ahmed has written once, "there are two main topics of discussion in literary criticism: The first is: what is written? And secondly, how is it written?"

The research design of this study is Qualitative using textual analysis as a research method; on the backend Interviews, conferences, seminars, research papers, analytical work on poetry is also cited as was needed. Ali Yasir is among prominent contemporary writers and this thesis would be covering the work of Ali Yasir to the utmost with study and analysis to bring it to the place it justified in the Urdu literature.

اظہارِ تشکّر

اس مقالے کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کی بدولت ممکن ہوئی۔ شکر ہے اس پاک ذات کا جو رحمن اور رحیم ہے۔ پاک پروردگار کے شکر کے بعد میں ان تمام اساتذہ کرام کی ممنون ہوں جو بچپن سے لے کر آج تک میرے اس تعلیمی سفر میں میرے ہمراہ رہے اور جن کی کاوشوں کی بدولت میں آج اس مقام پر پہنچی۔ اس کے علاوہ اپنے ان تمام اساتذہ کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے ایم فل کے کورس ورک کے دوران میری بھرپور رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ جن میں ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر صائمہ نذیر، مسز انجم مبین، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر ارشاد بیگم اور ڈاکٹر صنوبر الطاف شامل ہیں۔

مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مشکل مرحلے میں موضوع کے انتخاب کے لیے میری نگرانِ مقالہ کے ساتھ ساتھ قابلِ احترام اور شفیق استاد ڈاکٹر شفیق انجم نے میری بھرپور مدد اور رہنمائی کی، جس کے لیے میں ان کی بے حد ممنون ہوں۔ سب سے زیادہ شکریے کی مستحق میری نگرانِ مقالہ ڈاکٹر روبینہ شہناز ہیں جنھوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل کے دوران آنے والے ہر مرحلے میں میری بھرپور رہنمائی کی اور قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کے قیمتی وقت کی دستیابی اور رہنمائی کی وجہ سے آج میں اس مقالے کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے جب بھی مقالے کی تکمیل کے دوران رہنمائی کی ضرورت پڑی تو انھوں نے ایک ہمدرد استاد کی حیثیت سے ہمیشہ وقت دیا۔ ان کی دعائیں اور ان کا پیار میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اور میرے لیے ڈاکٹر روبینہ شہناز اور ڈاکٹر فوزیہ اسلم انتہائی قابلِ احترام ہیں۔

اس کے بعد سب سے زیادہ شکریے کے مستحق میرے والد محترم ہیں جنھوں نے باپ ہونے کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ماں کی ذمہ داریاں بھی بھرپور انداز سے نبھائیں۔ ان کی بے انتہا قربانیوں اور دن رات کی محنت نے مجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔ تعلیم کے تمام اخراجات کے علاوہ تعلیم کے لیے ایک اچھا ماحول بھی فراہم کیا۔ میں اپنی بڑی بہن سدرہ طاہر کی بہت شکر گزار ہوں جس نے میرے ایم فل کے کورس ورک اور اس مقالے کی تکمیل میں میری بھرپور رہنمائی کی۔ میں اپنے دادا جان (بشیر احمد فانی) کی محبت اور دعاؤں کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں۔ چچا جان (طارق فانی ایڈوکیٹ) کی تہہ دل سے احسان مند ہوں کہ

انھوں نے اس مقالے کے لیے مواد کی جمع آوری تک ہر لحاظ سے میرا ساتھ دیا۔ میں اپنی چچی (نورین طارق) جنھوں نے اس مقالے کی پروف ریڈنگ میں میری بھرپور مدد کی ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔ علی احسن اور محمد طیب کے پیار اور اپنائیت کی بے حد شکر گزار ہوں۔

میں اپنے ان تمام ہم جماعت ساتھیوں اور احباب کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ جن میں خصوصاً سید تصدق حسین، شیما سعدیہ، شمائلہ، محمد احمد، عارف حسین، سید محسن عالم شاہ، عقیل حیدر شامل ہیں۔

ان شخصیات کے ساتھ ساتھ میں ڈاکٹر راشد حمید کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے مقالے کے خاکے کی تکمیل کے لیے علی یاسر کی غزلیات کی کتب اپنی ذاتی لائبریری سے فراہم کیں اور ان کے متعلق بنیادی معلومات بھی فراہم کیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اور ڈاکٹر جنید آزر کے تعاون کے لیے ان کی بے حد ممنون ہوں۔ ڈاکٹر علی یاسر کی اہلیہ شازیہ علی اور ان کے بیٹے عمار علی یاسر اور ان کے تمام اہل خانہ کی بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے تحقیقی کام سے متعلق تمام تر مواد فراہم کرنے میں بھرپور تعاون کیا۔

عارفہ طاہر

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

میرے ایم۔ فل کے مقالے کا مجوزہ موضوع " معاصر ادبی روایت کا مطالعہ :ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی و تنقیدی جہات کا تجزیہ " ہے۔ علی یاسر ہمہ جہت علمی شخصیت تھے۔ آپ کا اصل نام غلام علی تھا۔ آپ ۱۹۷۶ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ عصرِ حاضر کے اس نوجوان شاعر نے ۴۴ برس عمر پائی اور ۱۷ فروری ۲۰۲۰ء کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ان کی شہرت کا باعث ان کی غزل گوئی ہے۔ "ارادہ" اور "غزل بتائے گی" ان کی غزلیات کے مجموعے ہیں۔ "ارادہ"۲۰۰۷ءمیں اور "غزل بتائے گی" ۲۰۱۶ ءمیں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوئی۔ "اردو غزل میں تصور فنا و بقا" ان کی تحقیقی کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن سے ۲۰۲۰ ءمیں شائع ہوئی جبکہ "کلیات منظور عارف تحقیق و تدوین" طباعت کے مراحل میں ہے۔ علی یاسر اکادمی ادبیات میں افسر مطبوعات تھے۔ ان کی زیر نگرانی کئی کتب تدوین اور طباعت کے مراحل سے گزریں۔ آپ "اہل قلم ڈائریکٹری" کے مرتب ہیں۔ آپ نے بطور مترجم بھی خدمات سرانجام دیں۔ جن میں پنجابی افسانوں، نوبیل لیکچر اور چین کی نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ جو مختلف رسائل خصوصاً ادبیات میں شائع ہو چکے ہیں۔ علی یاسر پی ٹی وی کے مختلف پروگراموں کے لیے سکرپٹ بھی تحریر کرتے رہے۔ آپ اشارہ انٹرنیشنل ادبی و ثقافتی تنظیم کے صدر رہے۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ تحقیق کے متقاضی ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ

ڈاکٹر علی یاسر کا شمار دورِ حاضر کے نوجوان غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلیات کی کتب شائع ہو چکی ہیں، ان کی شخصیت کی دیگر جہات بھی موجود ہیں لیکن ان پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ اس لیے اس تحقیق سے راولپنڈی میں رہنے والے لکھاریوں کی روایت میں علی یاسر کی تخلیقات اور ادبی جہات کو بہتر انداز میں سمجھنے کا موقع ملے گا۔ ان کی ادبی جہات موضوعاتی اور اسلوبی اہمیت کی حامل ہیں جن کو سامنے آنا چاہیے۔ اسی اہمیت اور جواز کے پیشِ نظر اس موضوع پر کام کرنا بنیادی مسئلہ تحقیق ہے۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

ا۔ علی یاسر کی شاعری کے موضوعات کا جائزہ لینا

۲۔ علی یاسر کی شاعری کا اسلوبی جائزہ لینا

۳۔ علی یاسر کی تحقیق اور متفرقات کا تجزیہ کرنا

iv۔ تحقیقی سوالات

اس تحقیقی مقالے کے لیے درج ذیل سوالات کو مد نظر رکھا جائے گا۔

ا۔ علی یاسر کی شاعری کے موضوعات کون کون سے ہیں؟

۲۔ علی یاسر کا اسلوبِ بیان کن خصوصیات کا حامل ہے؟

۳۔ علی یاسر کی تحقیق اور متفرق ادبی خدمات کی نوعیت کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار

پیشِ نظر موضوع تحقیق ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی و تنقیدی جہات کا تجزیہ ہے۔ مجوزہ تحقیق کے نظری دائرہ کار کے سلسلے میں دو کتب پیشِ نظر رہیں۔ ایک کلیم الدین احمد کی کتاب "ادبی تنقید کے اصول" اور دوسری ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب "ادبی تنقید"۔ ان دونوں ناقدین نے ادب کی معنویت زندگی اور سماج کے تناظرات میں طے کی ہے۔ کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ ادبی تنقید کے دو واضح مباحث ہیں۔ ایک یہ کہ "کیا لکھا ہے" اور دوسرا "کیسا لکھا ہے اور زندگی اور سماج سے اس کا کیا تعلق ہے۔ علی یاسر کی ادبی جہات کا جائزہ لیتے ہوئے ان مباحث کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ادب میں یہ رجحان عام ہے کہ اکثر شعرا اور ادیبوں پر ان کی وفات کے بعد ایسا کام کیا جاتا ہے جس میں ان کی تمام ادبی خدمات کو یکجا کیا جاتا ہے۔ اس طرزِ تحقیق میں اس شخصیت کے حالات زندگی اور تمام ادبی خدمات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں بھی اسی طرز پر علی یاسر کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

زیرِ نظر مقالے میں دستاویزی طریقہ تحقیق اپناتے ہوئے درج ذیل امور پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

۱۔ بنیادی ماخذات تک رسائی کے لیے ڈاکٹر علی یاسر کے اہل خانہ سے ملاقات اور انٹرویوز کیے گئے۔

۲۔ بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۔ معاصر ناقدین اور علی یاسر کے دوست احباب، اساتذہ جن میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر جنید آزر، ڈاکٹر راشد حمید، اختر رضا سلیمی، ڈاکٹر الیاس بابر اعوان سے انٹرویوز بذریعہ سوالنامہ کیے گئے۔

۴۔ معاصر ادبی جرائد میں شائع ہونے والے تبصروں اور تجزیوں کی نقول فراہم کی ہیں۔

۵۔ انٹرویوز، کانفرنسس، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ فنِ شاعری اور تحقیق و تنقید پر مشتمل تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شاملِ تحقیق ہے۔ جن میں سے چند کی فہرست ثانوی کتب میں دی گئی ہے۔ مزید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا نیز آن لائن کتب اور قابل قدر ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا گیا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

مجوزہ موضوع ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی و تنقیدی جہات کا تجزیہ ایک تحقیقی کاوش ہے۔ اس ضمن میں ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کسی بھی سطح پر تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ البتہ اس سے قبل مختلف شخصیات پر کام کیا گیا ہے جیسا کہ اکادمی ادبیات سے شائع کردہ پاکستانی ادب کے معمار سیریز اہمیت کی حامل ہے۔ جن میں شخصیات کی ادبی خدمات کو یکجا کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے قاری نہ صرف اس شخصیت سے واقفیت حاصل کرتا ہے بلکہ اس کی ادبی خدمات سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ اس مقالے کی نوعیت محض علی یاسر کی خدمات کو یکجا کر کے پیش کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی ادبی جہات کا تجزیہ بھی متعین اصولوں کی پیروی میں شامل ہے۔ اس سے قبل جن شخصیات کی ادبی خدمات یکجا کی گئی ہیں، ان میں اکثر زندہ شخصیات شامل ہیں۔ لیکن زندہ ادیب کی ادبی خدمات پر تحقیق ایک نامکمل کام ہے کیونکہ زندہ ادیب کی ادبی خدمات اس کی حیات کے اختتام تک جاری رہتی ہیں۔ اسی لیے اس قسم کا تحقیقی کام نامکمل رہتا ہے۔

علی یاسر کم عمری میں ہی وفات پا گئے اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے اس سے قبل کسی قسم کا تحقیقی کام بھی نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کسی ایک جہت پر کام کرنے کے بجائے علی یاسر کی ادبی جہات پر تحقیقی کام زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

viii۔ تحدید

اس تحقیق کا دائرہ کار ڈاکٹر علی یاسر کی تخلیقی و تنقیدی جہات کے تجزیہ تک محدود ہے۔ جو ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کام پر مشتمل ہے۔ تحقیقی تجزیے کے لیے علی یاسر کی مطبوعہ کتب "ارادہ"، "غزل بتائے گی"، "اردو غزل گوئی میں تصورِ فنا و بقا"، "کلیات منظور عارف: تحقیق و تدوین" پر انحصار کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے سکرپٹس، مختلف رسائل و جرائد میں موجود کلام، مضامین، اور تراجم بھی شامل تحقیق ہیں۔ جن کی فہرست بنیادی ماخذات میں پیش کی گئی ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر شعری اور نثری تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جن میں کلیم الدین احمد کی کتاب "ادبی تنقید کے اصول"، ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب "ادبی تنقید" نیز غزل گوئی کی بنیادی کتب، ڈاکٹر طارق ہاشمی کی کتاب "اردو غزل، نئی تشکیل"، وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ نیز ڈاکٹر ظفر السلام خان کی کتاب اصولِ تحقیق جدید ریسرچ کے اصول و ضوابط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صوبیہ سلیم اور محمد صفدر رشید کی مرتبہ کتاب فنِ ترجمہ کاری سے بھی پس منظری مطالعہ کے طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

عہدِ حاضر میں علی یاسر کو ایک اہم مقام حاصل تھا مگر اس حوالے سے ایسی کوئی تحقیق منظرِ عام پر نہیں آئی جو ان کے فن کی تفہیم اور ادبی جہات کے تجزیے کے لیے معاون ہو۔ لہٰذا یہ تحقیق علی یاسر کے تخلیقی و ادبی افکار کے تجزیے کے طور پر خاص اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ اس تحقیق کے ذریعے علی یاسر کے فن کی نہ صرف تفہیم ہوئی بلکہ ان کی ادبی جہات بھی منظر عام پر آسکیں۔

ب۔ علی یاسر: سوانحی کوائف

علی یاسر کا شمار دورِ حاضر کے جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا نام معاصر اردو غزل کا منفرد حوالہ ہے۔ علی یاسر نے جدید اردو غزل میں کلاسیکل اور جدید لہجے کے امتزاج سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ علی یاسر کی غزل گوئی فکر و فن کے اعتبار سے انفرادیت اور اہمیت کی حامل ہے۔ جدید غزل کا نمائندہ شاعر علی یاسر پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لیا جائے تو دوسرے ادیبوں

کی طرح علی یاسر نے بھی زندگی کے نشیب و فراز کا سامنا کیا۔ علی یاسر متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد ہندوستان کے ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے اور ہجرت کر کے پاکستان کے ضلع گجرانوالہ میں مقیم ہوئے۔ ان کے دادا کا نام امیر علی تھا جو پنجابی زبان کے مشہور شاعر تھے اور دادی کا نام مہر بی بی تھا۔ علی یاسر کے والد کا نام حبیب حیدر ہے جو زراعت کے پیشے سے منسلک تھے اور والدہ کا نام مختاراں بی بی ہے جو ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کا ننھیال فیصل آباد میں مقیم ہے۔ علی یاسر کا تعلق علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کے دادا (مرحوم) بھی اردو اور پنجابی کی مختلف اصناف میں شاعری کرتے تھے۔ انھیں صوفیا کرام اور صوفیانہ شاعری سے لگاؤ تھا۔ اپنے دادا سے متاثر ہو کر انہوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ اس حوالے سے علی یاسر نے رسالہ "ادبی دنیا" میں ڈاکٹر محمد حسین سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ:

"میرے دادا جان مرحوم اردو اور پنجابی کی متفرق اصناف میں شاعری کرتے تھے اور لدھیانہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ہمارے گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ میں گجرانوالہ کے ایک گاؤں کوٹلی صاحبو میں پیدا ہوا۔"(۱)

علی یاسر کا اصل نام غلام علی تھا۔ جب کہ ادبی دنیا میں انہیں علی یاسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شاعری میں بھی علی یاسر بطور تخلص استعمال کرتے تھے۔ علی یاسر ۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کو پاکستان کے شہر گجرانوالہ کے چھوٹے سے گاؤں کوٹلی صابو میں پیدا ہوئے۔ ویسے تو والدین کو اپنی اولاد سے فطری محبت ہوتی ہے لیکن علی یاسر سے ان کے والدین کی انسیت کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ علی یاسر اپنے والدین کی دعاؤں سے ان کی پہلی اولاد تھے۔ ان کے والد کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر کی پیدائش پر اہل خانہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ مٹھائی بانٹی گئی اور صدقہ و خیرات کیا گیا کیوں کہ علی یاسر ہمارا پہلا بیٹا تھا اور خاندان کی آنکھ کا تارا تھا۔"(۲)

علی یاسر کے والد نہایت شفیق اور مہربان انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ علی یاسر محنتی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لائق بیٹے، وفادار شوہر، ذمہ دار باپ اور احساس کرنے والے بھائی تھے۔ علی یاسر کے پانچ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ ان کے بھائی ضلع گجرانوالہ میں مختلف پیشوں سے منسلک ہیں۔ جب کہ ان کی بہنیں گھریلو خواتین ہیں۔ علی یاسر سب بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ آپ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ ان کی ضروریات

اور خواہشات کا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات بھی خود برداشت کیے۔ اس حوالے سے ان کے والد کا کہنا ہے کہ:

"گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں اپنے تمام بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کر سکوں۔ علی یاسر کی دن رات کی محنت کی وجہ سے اس کے بہن بھائیوں کے سکول کی فیسیں ادا ہوئیں اور وہ تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔"(۳)

علی یاسر دراز قد، صحت مند، قوی و توانا ڈیل ڈول والے پر وقار مگر حساس اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے لباس کا انتخاب نہایت سادہ تھا۔ شلوار قمیض کے ساتھ واسکٹ پہنتے تھے۔ کشادہ پیشانی اور خوبرو چہرے سے ڈاڑھی موچھ منڈوا کر رکھتے تھے۔ سر پر گھنے بال تھے جنہیں وہ نہایت سلیقے سے سنوار کر رکھتے تھے۔ ان کی شخصی خوبی تھی کہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے اور ہمیشہ دوسروں کے کام آتے تھے۔ آپ مہمان نواز تھے۔ اگر ان کے گھر کوئی مہمان آجاتا تو اس کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ:

"ہمارے گھر جب بھی علی یاسر کا کوئی دوست آتا یا کوئی بھی مہمان آتا تو اس کی خوب خاطر تواضع کرتے۔ کھانا کھلائے بغیر گھر سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اگر کھانے کی طلب نہ ہوتی تو چائے پلائے بغیر گھر سے جانے نہیں دیتے تھے۔"(۴)

اسی محبت اور اپنائیت کی بنا پر ان کے بے شمار دوست تھے۔ علی یاسر مشکل وقت میں اپنے دوستوں کے کام آتے تھے۔ ان کے دوست بھی ان کی اچھی عادات اور خلوص کی وجہ سے ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر کی طبیعت اتنی حساس تھی کہ اگر کوئی شخص دکھی ہوتا تو ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی اور جہاں تک ممکن ہوتا اس کی تکلیف دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ ان کی حساس طبعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ٹی وی دیکھنے کے دوران کسی ڈرامے میں کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتی دیکھتے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔"(۵)

علی یاسر کا تعلیمی سفر بھی تکالیف سے پُر ہے۔ آپ کو تعلیمی سفر کے دوران بہت سی معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ بہت بہادری کے ساتھ ان مشکلات کا سامنا کیا۔ انہوں نے

اپنی زندگی کے ابتدائی سولہ سال گوجرانوالہ میں اپنے والدین کے ساتھ گزارے۔ علی یاسر نے دینی اور پرائمری تعلیم بھی گوجرانوالہ کے گورنمنٹ سکول کوٹلی صابو سے حاصل کی جو ان کے گھر سے آدھے میل کے فاصلے پر واقع ہے، سیکنڈری تعلیم منگلا سکول راہولی کینٹ گجرانوالہ سے حاصل کی اور ۱۹۹۱ء میں میٹرک کا امتحان سائنس کے مضامین میں درجہ اول سے پاس کیا۔ طلبہ جب تک محنت اور لگن سے تعلیم حاصل نہیں کرتے اس وقت تک امتحان میں نمایاں کامیابی نہیں مل سکتی۔ علی یاسر کی نمایاں کامیابی سے ان کی محنت اور لگن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انٹرویو کے دوران علی یاسر کے والد سے معلوم ہوا کہ میٹرک میں کامیابی کے بعد انہوں نے اپنے دادا سے کالج میں داخلہ لینے کی فرمائش کی۔ وہ انہیں اپنے ساتھ گاؤں سے دور ایک شہر میں اپنے ایک دوست سے ملوانے لے گئے۔ اس شہر میں دو ہی کالج تھے۔ ایک اسلامیہ اور دوسرا گورنمنٹ کالج۔ ان کے دوست نے علی یاسر کا داخلہ گورنمنٹ کالج میں آدھی فیس پر کروایا کیوں کہ وہاں کے دونوں کالجوں میں سے اس کالج کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا۔ تعلیم کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حسین سے گفتگو کے دوران علی یاسر نے بتایا کہ:

"میں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول راہوالی گوجرانوالہ کینٹ سے کیا۔ ایف ایس سی کے بعد میں اسلام آباد آ گیا اور کئی ملازمتوں کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرتا رہا۔"(۶)

علی یاسر نے ایف ایس سی کا امتحان بھی ۱۹۹۳ء میں گوجرانوالہ کے گورنمنٹ کالج سے پاس کیا۔ انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کالج کا ماحول علی یاسر کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہاں کے چند اوباش قسم کے طلبہ تھے جو مختلف تنظیموں میں بٹے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہیں ایسی جگہ تعلیم جاری رکھنا سازگار نہ لگا۔ علی یاسر نے جب انٹر کا امتحان پاس کیا تو ان کے والد صاحب انہیں کھاریاں کے ایک گاؤں میں اپنے دوست کے ہاں لے گئے اور ان کی نوکری کے سلسلے میں بات کی۔ ان کے والد کے دوست نے بتایا کہ ان کا بیٹا بریگیڈیئر ہے۔ بعد ازاں وہ علی یاسر کو اپنے بیٹے سے ملوانے لے گئے۔ اس نے علی یاسر کا انٹرویو لینے کے بعد کہا کہ جب کوئی آسامی آئی تو میں ملازمت پر رکھوا دوں گا لیکن علی یاسر نے فوج کی نوکری میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا کیوں کہ ان کی طبیعت میں سادگی تھی۔ اس حوالے سے علی یاسر کے والد صاحب کا کہنا ہے کہ:

"جب میں علی یاسر کو اپنے دوست کے ذریعے فوج میں بھرتی کروانے کے لیے لے گیا تو علی یاسر نے کہا کہ ان کا مزاج نہیں کہ وہ فوج کی نوکری کر سکیں تو میں

نے کہا کہ دو ہی راستے ہیں یا تو ایم۔ اے کر کے دکھانا پڑے گا اگر وہ نہیں تو فوج
میں بھرتی ہونا زیادہ مناسب ہے۔ اس پر یاسر نے ایم۔ اے کرنے کا وعدہ کیا اور
اللہ کے حکم سے اس نے مجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ ایم۔؟ اے بھی کیا اور
ڈاکٹریٹ کر کے اپنی تعلیم بھی مکمل کی۔ علی یاسر ہمارے خاندان کا پہلا وارث تھا
جس نے پی ایچ ڈی کر کے تعلیم مکمل کی۔"(۷)

بعد ازاں ان کے دادا علی یاسر کو لے کر اسلام آباد آ گئے اور یہاں موجود اپنے دوست چوہدری محمد شفی سے ملوایا جن کا تعلق بھی گوجرانوالہ ہی سے تھا ۔ علی یاسر ان کے ساتھ اسلام آباد میں رہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد حسین سے دورانِ گفتگو علی یاسر نے بتایا کہ:

"جب میں اسلام آباد آیا تو بالکل کم عمر تھا یہاں کوئی جاننے والا نہ تھا اور
نہ ہی یہاں کے دبستان میں اپنی جگہ بنانے میں کسی کی حوصلہ افزائی
تھی۔"(۸)

کم عمر علی یاسر نے انجان مقام پر اپنی نمایاں پہچان پیدا کی نہ صرف اپنی جگہ بنائی بلکہ جہاں جس دبستان میں ان کے جاننے والا کوئی نہ تھا وہاں سب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ان کے تعلیمی سفر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پڑھائی کا بچپن سے ہی بہت شوق تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے نہ صرف سفر کیا بلکہ معاشی مشکلات کا سامنا بھی حوصلے سے کیا۔ آپ نہایت محنتی انسان تھے۔ ہر وقت مختلف کتب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی اہلیہ نے بتایا کہ:

"علی یاسر کو پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ فارغ وقت میں زیادہ تر وقت
کتابوں کا مطالعہ کرنے میں گزارتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے کوئی
نہ کوئی کتاب ضرور پڑھ کر سوتے تھے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول
تھا۔"(۹)

علی یاسر کا یہ مطالعہ ان کی شاعری میں ان کے خیالات کا عکاس ہے۔ علی یاسر اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرتے رہے تاکہ تعلیمی اخراجات کو پورا کرتے ہوئے اپنی تعلیم مکمل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ انھوں نے ۱۹۹۷ء میں گریجوایشن اور ۲۰۰۲ء میں اپنے والد کی خواہش پر ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے ایم۔ اے اردو ادب کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی ۔ اس کے بعد ایم ۔ فل اور

پی۔ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ۲۰۱۲ء میں ایم۔فل اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے مکمل کیا، ایم۔فل کے مقالے کا موضوع "کلیات منظور عارف تحقیق و تدوین" تھا اور پی۔ایچ ڈی اردو کی ڈگری بھی ۲۰۱۹ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے حاصل کی۔ڈاکٹر محمد حسین سے دورانِ گفتگو علی یاسر نے بتایا کہ:

"ایف ایس سی کے بعد میں اسلام آباد آ گیا اور کئی ملازمتیں کرتا رہا اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرتا رہا۔ میں نے آدھی چھٹی لے کر بی۔اے، ایم۔اے اور پی۔ایچ ڈی کے امتحان دیے اور پی۔ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "اردو غزل میں تصورِ فناو بقا تحریر کیا۔"(۱۰)

ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع "اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا" ہے۔ آپ نے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی زیرِ نگرانی اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ علی یاسر کو اپنے استاد سے عقیدت کی حد تک لگاؤ تھا۔ ان کی ایک دوسرے سے شناسائی کا عرصہ بہت طویل تھا۔ ان کے استاد بھی ان سے بہت محبت کرتے اور ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ڈاکٹر جنید آزر کے مطابق:

"علی یاسر کے ڈاکٹریٹ کے نگران ارشد محمود ناشاد تھے جن سے ان کو بے حد عقیدت تھی۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ علی یاسر کے ساتھ میرا اور ایک اور لڑکے کاشف عرفان کا مقالہ یونیورسٹی میں جمع ہو چکے تھے لیکن علی یاسر کو سب سے پہلے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔"(۱۱)

اس حوالے سے خود ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اشارہ انٹر نیشنل کے زیر اہتمام اکادمی ادبیات میں ہونے والے مشاعرے "بیادِ علی یاسر مشاعرہ" میں کہتے ہیں کہ "علی یاسر ایک جوئے رواں تھا۔ ایسا محنتی طالب علم علی یاسر ہی ہو سکتا تھا جس نے خود اپنی محنت سے یہ مقام حاصل کیا کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے کے فوراً بعد ہی اس کا مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ورنہ بہت سے مقالے الماریوں کی دھول کی نذر ہو چکے ہیں۔ میں تو اسے کہا کرتا تھا یہ شاعری چھوڑو اپنی تحقیق پر توجہ دو لیکن وہ اتنا قابل تھا اس نے دونوں کام بہترین انداز میں جاری رکھے اور آج یہی وجہ ہے کہ اس کی ایک الگ پہچان ہے۔اب تو اس کی زندگی میں سکون کے دن آئے تھے اس کی زندگی بھر کی محنت کا پھل ملنا تھا۔افسوس اس کی زندگی کا سفر اتنا ہی تھا۔"

تاریخ میں جہاں کہیں بھی تبدیلی کی تحریک چلی متوسط طبقے نے اہم کردار ادا کیا ۔ علی یاسر چونکہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے والد ان کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا اسلام آباد آنے کے بعد علی یاسر نے مختلف جگہوں پر بچوں کو ٹیوشن پڑھائیں۔ آپ جو کماتے تھے وہ اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے میں لگا دیتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسین سے گفتگو کے دوران ملازمت کے حوالے سے علی یاسر نے بتایا کہ: "شاعری، ملازمت، اسکرپٹ رائٹنگ کے ساتھ ساتھ کئی یونیورسٹیوں میں اردو ادب کے طالب علموں کو بھی پڑھا رہا ہوں۔"(۱۲)

علی یاسر نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ بزم علم و فن میں شوکت واسطی کے ساتھ بہت وقت گزارا۔ اس کے بعد اسماعیل زیدی کے ہاں بھی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۸ تک سبرو ایئر کنڈیشننگ اسلام آباد میں اسسٹنٹ مینیجر (ایڈمن) کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۱ء تک پنجاب سوشل سیکیورٹی ہسپتال میں کمپیوٹر کے شعبے میں ملازم رہے۔ اگست ۲۰۰۱ء سے جنوری ۲۰۰۶ء تک پی ٹی سی ایل کے محکمے میں آفس سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ ہیومن ریسورسس جافر برادران میں بطور آفیسر نادرہ پروجیکٹ کام کیا۔ ریڈیو ٹی وی میں بھی بطور اینکر ملازمت کی۔ اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، ایف ایون تھری میں عارضی لیکچرار کے طور پر خدمات انجام دیں۔ علامہ اقبال یونیورسٹی میں ٹیوٹر اور جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے وابستگی رہی۔ ڈاکٹر جنید آزر کا کہنا ہے کہ:

> "علی یاسر نے معاشی ذمہ داریوں سے عہد بر آہونے کے لیے یونیورسٹی میں پیپر مارکنگ سے لیکچر دینے تک ہر جگہ اپنے آپ کو متحرک رکھا۔ اس نے ٹی وی چینلز اور ریڈیو کے لیے مختلف خدمات سرانجام دیں ۔ سکرپٹ لکھے پروگرامز کیے۔"(۱۳)

علاوہ ازیں مختلف اخباروں اور رسائل میں بطور رپورٹر اور ایڈیٹر کام کرتے رہے۔ علی یاسر کو محنت کرنے اور آگے بڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس حوالے سے ان کے والد کا کہنا ہے کہ:

> "علی یاسر کی سب سے پہلی نوکری آٹھ ہزار روپے پر ہوئی تو علی یاسر کہنے لگا: تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ میں نے بیٹے سے کہا کہ اتنی تنخواہ بہت ہے تو علی یاسر نے مجھ سے کہا: نہیں! میں اس سے مزید بہتر نوکری ڈھونڈوں گا۔ میرے بیٹے کو زندگی

میں آگے بڑھنے اور محنت کا بہت شوق تھا اور جو بھی کام کرتا تھا بہت ایمان داری سے کرتا۔"(۱۴)

کچھ عرصے بعد علی یاسر کی ملاقات علی اکبر عباس سے ہوئی اور وہی ان کی اکادمی ادبیات میں نوکری کا وسیلہ بنے۔ علی یاسر یہاں پر افسرِ مطبوعات کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ رات بھر محنت کرتے اور کتابوں کی تدوین کا کام کرتے رہتے۔ علی یاسر اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ والد صاحب کو دیتے اور جب کبھی عید یا اور کوئی موقع آتا تو بھی گھر جا کر سب گھر والوں کو پیسے دیتے۔ ان کے والد کے مطابق:

"علی یاسر کی اکادمی ادبیات میں نوکری علی اکبر عباس نے کروائی۔ علی یاسر حلال رزق کمانے کی خاطر دن رات محنت کر کے جتنا بھی کام ہوتا ایمان داری سے کرتا تھا۔ جب بھی تنخواہ ملتی تھی اس میں سے کچھ پیسے خرچے کے مجھے دیتا۔ کسی بھی تہوار پر گاؤں آتا تو سب بہن بھائیوں کے لیے تحفے لاتا۔ یاسر کو اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ ان کو کبھی بھی تکلیف سے گزرنے نہیں دیتا تھا۔"(۱۵)

علی یاسر نے دورانِ ملازمت اکادمی ادبیات سے قرض لے کر اپنا گھر بنایا اور گاڑی بھی لی۔ اس قرض کے پیسے ماہانہ ان کی تنخواہ سے کٹتے رہتے تھے۔ ان کے دوست احباب کا سلوک بھی ان کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بھی علی یاسر کا کافی ساتھ دیا۔

علی یاسر مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور ان میں رونق محفل ہوتے۔ انہوں نے متحدہ عرب امارات میں نومبر ۲۰۱۴ء کو دو مشاعروں میں شرکت کی۔ جن میں سے پہلا مشاعرہ پاکستان ایسوسی ایشن دبئی جبکہ دوسرا پاکستان ایمبیسی ابو ظہبی میں منعقد ہوا۔ نئی دلی (بھارت) میں منعقد جشنِ ادب عالمی مشاعرے میں نومبر ۲۰۱۵ء کو شرکت کی۔ مسقط (عمان) جولائی ۲۰۱۹ء میں منعقد ہونے والے پہلے پاکستان فیسٹیول میں ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی۔ بہت سے پبلک، تعلیمی اداروں اور ریڈیو ٹی وی کے نعت، غزل، سلام و دیگر موضوعاتی مشاعروں میں شرکت کرنے کے علاوہ پی ٹی وی کے لیے بہت سی دستاویزی فلمیں، سکرپٹ اور نغمے لکھے۔ پی ٹی وی کے کئی ادبی پروگراموں کی کمپیئرنگ کی۔ بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بین الکلیاتی مقابلوں میں منصفی کے فرائض بھی انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد حسین سے اس بارے میں ذکر کرتے ہوئے علی یاسر نے بتایا کہ:

> "مجھے سینکڑوں قومی مشاعروں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ملک سے باہر متحدہ عرب امارات اور بھارت میں بھی مجھے مشاعروں میں پاکستان کی نمائندگی پر فخر ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن، کئی پرائیویٹ چینلز اور ریڈیو پر کئی پروگراموں اور مشاعروں کی میزبانی کی۔ پی ٹی وی کے لیے بہت سی دستاویزی، فلمیں گیت، سکرپٹس، شوز اور پروگراموں کو تحریر بھی کر چکا ہوں۔"(۱۶)

۱۹سال کی عمر میں علی یاسر کی شادی گوجرانوالہ میں ان کے رشتے داروں میں ہوئی۔ آپ کی شریک حیات کا نام شازیہ علی ہے۔ جو ایک خوش مزاج اور ملنسار خاتون ہیں۔ انٹرویو میں ان کی اہلیہ نے بتایا: شادی سے پہلے علی یاسر نے اپنی اہلیہ کو پہلی مرتبہ ان کے گھر میں ایک تقریب کے دوران دیکھا اور اپنے والد صاحب سے اپنی پسند اور شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ یوں دونوں خاندانوں کی باہمی رضامندی سے ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنی پڑھائی اور ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی شریکِ حیات کو بھی تعلیم دلوائی اور خوش گوار زندگی بسر کرنے کے لیے حالات کے نشیب و فراز کا مقابلہ دن رات کی محنت سے کیا۔ اس حوالے سے علی یاسر کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ:

> "علی یاسر اچھے بیٹے اور باپ ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار شوہر تھے۔ مالی مشکلات کے باوجود اگر میں کسی بھی چیز کی خواہش کرتی تو وہ اسی وقت پوری کرتے تھے۔ اپنی تعلیم اور بچوں کے تعلیمی اخراجات کے باوجود مجھے بھی تعلیم دلوائی اور ان کی خواہش تھی کہ میں بھی ان کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ انہوں نے ساری زندگی اپنے تمام رشتوں میں توازن برقرار رکھا۔ رشتوں کے ساتھ ساتھ ملازمت اور گھر کو بھی بہترین طریقے سے لے کر چلے۔ انہی اچھائیوں کی بنیاد پر میرے دل میں ان کی قدر روز بروز مزید بڑھتی گئی۔"(۱۷)

علی یاسر کی اہلیہ شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک گاؤں میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہیں۔ بعد ازاں بڑے بیٹے عمار علی یاسر کی پیدائش کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ اسلام آباد مقیم ہو گئیں۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام عمار علی یاسر، اس کے بعد محسن علی یاسر، عزہ علی یاسر، زین علی یاسر اور سب سے چھوٹی بیٹی انا علی یاسر ہیں۔ ان کی اولاد جو کم عمری میں ہی والد کے دست شفقت سے محروم ہو گئے والد کی وفات کے بعد ان کے غم میں نڈھال ہیں جب کہ ان کے بڑے بیٹے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے

ہوئے اپنی والدہ اور اپنے تمام بہن بھائیوں کا سہارا بننے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ علی یاسر کی اولاد اسلام آباد میں ہی مقیم تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ علی یاسر اپنے بچوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتے۔ دفتر سے گھر آکر سب بچوں کو پیار کرتے۔ ان کے ساتھ کھیلتے۔ اس حوالے سے ان کے بیٹے عمار علی یاسر کا کہنا ہے کہ:

"بابا کا ہم تمام بہن بھائیوں کے ساتھ دوستانہ رویہ تھا۔ دفتر سے گھر آتے ہی سب کو پیار کرتے۔ ہماری فرمائش کے مطابق لُڈو، کرکٹ وغیرہ کھیلتے۔ اچھے باپ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے دوست بھی تھے۔ گھر میں ایسا ماحول فراہم کرتے تھے کہ ہمیں باہر دوستوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔"(۱۸)

علی یاسر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور محنتی انسان بنانا چاہتے تھے۔ آپ ان کی تعلیم کے حوالے سے کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ ان کے تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے مختلف اداروں میں جُز وقتی ملازمت بھی کرتے رہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں پیپر چیکنگ کرتے، ریڈیو اور مختلف ٹی وی چینلز کے لیے پروگرامز بھی کیے۔ اس حوالے سے ان کے قریبی دوست ڈاکٹر جنید آزر کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر بچوں کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتا تھا۔ اس نے بچوں سے دوستانہ مراسم رکھے ہوئے تھے اور ان کے مستقبل کے لیے آزادیِ رائے دے رکھی تھی۔ جس بچے میں جو ٹیلنٹ ہوتا وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔"(۱۹)

علی یاسر کی گفتگو کا انداز خوب صورت تھا۔ آپ دوسروں سے ہمیشہ نرم اور دھیمے لہجے میں مخاطب ہوتے۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے سب سے ملتے۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی وہی زبان پر بھی ہوتی تھی۔ کھانے پینے کے معاملے میں کبھی نخرے نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ کھانے میں بنا ہوتا صبر اور شکر کر کے کھا لیتے۔ ان کی طبیعت میں عاجزی و انکساری تھی۔ اس بات کا اندازا ڈاکٹر محمد حسین سے علی یاسر کی ہونے والی گفتگو سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے:

"میں ایک سادہ انسان ہوں اور ہر حلال چیز شوق سے کھاتا ہوں۔ میں نے کبھی نخرا نہیں کیا کہ یہ کھانا ہے یہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی ہر نعمت کو خوشی اور

شکر سے قبول کرنا چاہیے۔ تصنع میری ذات سے کوسوں دور ہے اور ادب اور فنونِ لطیفہ کا شیدائی ہوں۔"(۲۰)

علی یاسر کبھی کسی کو کم تر نہیں سمجھتے تھے۔ ملنسار اور سنجیدہ طبیعت کے حامل انسان تھے۔ جس سے بھی ملتے بہت ہی پیار و محبت سے ملتے۔ اگر کوئی پہلی مرتبہ بھی ان سے ملنے جاتا تو معلوم ہوتا تھا جیسے بہت پرانی جان پہچان ہو۔ ہر ایک کے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔ مہمان نوازی ان کی نمایاں خوبی تھی۔ جب بھی ان سے کوئی ملنے آتا تو اس کی خوب خاطر تواضع کرتے تھے۔ یاسر کا اپنے رفقا کے ساتھ ساتھ اپنے ماتحت ملازمین کے ساتھ بھی برتاؤ دوستانہ تھا۔

ہر انسان کام کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر پُر سکون رہنے کے لیے دیگر مشاغل کا سہارا لیتا ہے۔ علی یاسر کو بھی کرکٹ میچ دیکھنے کا بہت شوق تھا اور فرصت کے اوقات میں اپنے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلا بھی کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر جب میچ دیکھنے بیٹھتے تو اپنے بچوں کے ساتھ مل کر دیکھتے اور خوب محظوظ ہوتے۔ جب تک میچ ختم نہیں ہوتا تھا تب تک ٹی وی کے سامنے سے نہ اٹھتے تھے۔"(۲۱)

علی یاسر فرصت کے اوقات میں کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کو فکشن، شاعری اور اسلامی کتب بہت پسند تھیں۔ جب بھی فارغ وقت ملتا تو نئی کتابیں خرید کر لاتے اور ان کا مطالعہ کرتے۔ اس حوالے سے ان کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر وقتاً فوقتاً نئی کتابیں خرید کر لاتے۔ ان کی گھر میں موجود لائبریری میں ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں اور وہ فارغ وقت میں ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ رات کو جب تک کسی کتاب کا مطالعہ نہ کر لیتے انہیں نیند ہی نہیں آتی تھی۔"(۲۲)

علی یاسر کو مناظرِ فطرت سے بھی بہت لگاؤ تھا اور باغبانی ان کا ایک اور اہم مشغلہ تھا۔ آپ فرصت کے اوقات میں باغبانی کرتے تب ان کو فطرت کو قریب سے محسوس کرنے کا مزید موقع مل جاتا تھا۔ انہیں موسیقیت سے بہت لگاؤ تھا۔ فنونِ لطیفہ میں سرفہرست مشغلہ شاعری رہا۔ میر، اقبال اور غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ ڈاکٹر محمد حسین سے دورانِ گفتگو علی یاسر بتایا کہ:

"مجھے میر ، غالب اور اقبال سے حد درجہ عشق اور عقیدت ہے۔ میر اور غالب اپنے اپنے عہد کے لافانی اور دائمی عظمت کے حامل شعرا ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر فنونِ لطیفہ اور دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے ادب کو پڑھنا میرا شوق ہے۔"(۲۳)

علی یاسر نے بارہ سال کی عمر میں پہلی غزل لکھی ۔ غزل لکھنے کا شوق انہیں اپنے دادا جان کو شاعری کرتے دیکھ کر ہوا۔ لیکن ان کے والد ہمیشہ علی یاسر کو سمجھاتے کہ ان فضول کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے پڑھائی پر توجہ دو۔ ان کے والد صاحب اپنے بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ پڑھائی کے لیے بھی بہت فکر مند رہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے والد کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر کو سکول کے وقت سے ہی لکھنے لکھانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں یاسر پڑھائی چھوڑ کر ان کاموں میں نہ لگ جائے۔ میں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا کم سے کم ایم تک ضرور پڑھ لکھ جائے تا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے لیکن شاعری اس کے رگ و پے میں موجود تھی۔ اس کی طبعیت کی حساسیت نے اسے نکھار دیا۔"(۲۴)

علی یاسر سکول اور کالج میں منعقد ہونے والے ادبی پروگراموں میں حصہ لیتے رہے اور جب ان کی حوصلہ افزائی ہوئی تو ان کا شوق مزید بڑھتا گیا۔ علی یاسر نے ۱۹۹۰ء میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ غزل گوئی کی وجہ سے خوب شہرت پائی۔ ان کی غزلیات کے دو مجموعے "ارادہ" اور غزل بتائے گی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ ان کا اردو ادب میں اور بھی قیمتی سرمایہ موجود ہے جن میں نظمیں، حمد، نعتیں، منقبت، سلام، مرثیے، ماہیے اور گیت شامل ہیں جو ادبیات کے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیقی کتب، تحقیقی و تعارفی مضامین، انگریزی اور پنجابی سے اردو تراجم اور دستاویزی فلمیں موجود ہیں۔ علی یاسر نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ان کی اصلاح کرتے اپنے بڑوں کا احترام کرتے لیکن انہیں بہت سے شعرا سے گلہ رہتا کہ وہ باقاعدہ شاعر نہیں ہیں۔ علی یاسر کو شاعری کے عروض پر عبور حاصل تھا اس لیے بہت سے بڑے بڑے شعرا کی اصلاح بھی کر دیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جنید آزر کا کہنا ہے کہ:

"علی یاسر فنی طور پر بہت مضبوط تھا، فن اور عروض پر اسے دسترس کسی اُستاد سے کم نہیں تھی۔ وہ بڑے بڑے شعرا کی عروضی خامیوں کی نشاندہی کرتا۔ جونئیر کی

تو چھوڑیں مجھے کئی ایسے شعرا کا علم ہے جو پس پردہ اس سے مشورہ کرتے تھے۔"(۲۵)

علی یاسر ۴۴ برس کی عمر میں ۱۷ فروری ۲۰۲۰ء کو دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ ان کی وفات پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ان کی وفات سے ادب کا ایک اور چراغ گُل ہو گیا۔ ان کی وفات کے حوالے سے حسن عباس رضا لکھتے ہیں:

"۱۷ فروری ۲۰۲۰ء کی صبح انھیں برین ہیمرج کی تکلیف کے باعث ہسپتال منتقل کیا گیا۔ مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنی بیوہ، تین بیٹے اور دو بیٹیوں کے علاوہ پوری دنیا کو سوگوار کر دیا۔"(۲۶)

علی یاسر شاعری کے حوالے سے بہت معروف تھے اور علمی و ادبی حلقوں کی جان تصور کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کی وفات پر علمی و ادبی حلقوں میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور اہلِ علم اور اہلِ ادب نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور ان کی وفات کو سانحہ قرار دیا۔ ان کی وفات پر دعائیہ تقریبات منعقد ہوئیں۔ کچھ شعرا اور اہلِ قلم شخصیات نے ان کے لیے منعقد ہونے والی تعزیتی تقاریب میں اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے نظمیں پیش کیں۔ جن میں جلیل عالی، علی اکبر عباس، جمیل قمر اور نسرین سید شامل ہیں۔ جلیل عالی نے "بیاد علی یاسر" کے نام سے نظم لکھی، جس میں ان کی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ علی یاسر نے بطور شاعر بہت سا تخلیقی کام کیا ہے۔ جتنی بھی مشکلات آئیں ان کا اکیلے سامنا کیا۔ کبھی بھی دوسروں سے جلن محسوس نہیں کی۔ ادب میں اپنی محنت اور لگن کی بنیاد پر اپنا مقام پیدا کیا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ان کا مخلصانہ رویہ تھا۔ سب کے خیر خواہ تھے۔ یہاں تک کہ کبھی اگر ان کے بارے میں کسی نے برا سوچا یا برا کیا تو بھی علی یاسر نے اس کے لیے ہمیشہ دل میں نیک تمنائیں رکھیں۔ اس حوالے سے جلیل عالی کا شعر ملاحظہ ہو:

"ہر دوست کی توقیر بڑھائی دل وجاں سے
دشمن کو بھی نظروں سے گرایا نہیں اس نے"(۲۷)

علی یاسر نے نہ دنیا کا لالچ دل میں پیدا ہونے دیا اور نہ کبھی بے جا خواہشات کو دل میں جگہ دی بلکہ اپنے وسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی تخلیقی خواہشات کی تکمیل کی۔ حدود میں رہتے ہوئے ہر کام میں میانہ روی اختیار کی۔ جلیل عالی کا شعر ملاحظہ ہو:

"جتنی بھی عمر ملی سلیقے سے بسر کی

پاؤں حدِ چادر سے بڑھایا نہیں اس نے"(۲۸)

علی یاسر کی کم عمری کی موت نے ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا۔ ان کی تعزیتی تقریب کے موقع پر جلیل عالی نے جو نظم اپنے غم کے اظہار میں لکھی اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مرنا تو ہر انسان نے ہے لیکن اس کو کیا غم تھا کہ نو جوانی میں سب کو سوگوار چھوڑ کر چلا گیا۔ دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کا ذکر محفلوں میں رہتا ہے۔ اتنا مخلص دوست تھا کہ ابھی بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ لوٹ کر آجائے گا۔ اپنے دوستوں کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اس حوالے سے جلیل عالی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"جانا تھا اُسے بھی مگر اِس رنج کا کیا ہو

کس بات کی جلدی تھی بتایا نہیں اس نے

لگتا ہے وہ لوٹ آئے گا محفل میں اچانک

عالی کبھی یاروں کو بھلایا نہیں اس نے"(۲۹)

علی یاسر کی تعزیت کے موقع پر مشہور شاعر علی اکبر عباس نے بھی ایک نظم "تعزیتِ علی یاسر" کے نام سے لکھی۔ جس میں وہ علی یاسر کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ علی یاسر بہت بڑے کا دل مالک تھا۔ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے والا تھا لیکن اس کا اچانک اس دنیا سے چلے جانا ہمارے لیے سوگ کا باعث بنا۔ وہ ہر دل عزیز تھا۔ آپ ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مذہبی شخصیات بھی اس کی مغفرت کی دعائیں کرتی ہیں۔ اس حوالے سے علی اکبر عباس اپنی نظم میں لکھتے ہیں کہ:

"اللہ تجھ پہ کھول دے ابوابِ مغفرت

مسجد میں بھی دعائیں اور کنشت میں"(۳۰)

جمیل قمر نے بھی علی یاسر کے حوالے سے منعقد ہونے والی تعزیتی تقریب کے موقع پر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"علی یاسر تو جہاں میں تھا یگانہ پیارے

تیری ہستی تھی محبت کا خزانہ پیارے"(۳۱)

علی یاسر کی وفات پر صرف ان کے اہلِ خانہ ہی نہیں بلکہ ان کے تمام اہلِ قلم دوست احباب سب بہت رنجیدہ تھے۔ ان کی وفات کے بعد بطور تعزیت شاعرہ نسرین سید نے بھی علی یاسر کے نام ایک نظم لکھی

جس میں وہ لکھتی ہیں کہ میں دیارِ غیر میں ہوں اور مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ میرے وطن میں علی یاسر نام کا کوئی شخص تھا۔ جو لوگوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ جو شخص اس سے ایک بار مل لیتا وہ اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتا۔ بھلے نسرین سید نے علی یاسر کو نہیں دیکھا ہوا تھا مگر ان کی جوانی کی موت کی خبر نے انھیں بھی رنجیدہ کر دیا۔ نسرین سید اپنے غم کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"اپنی باری پہ سبھی کو ہے چلے جانا، مگر
اس جوانی میں بھلا کوئی جاتا ہے کیا؟
اے جوان مرگ قلم کار یہ عجلت کیسی؟
تُو بتا اے مرے فن کار یہ عجلت کیسی؟"[۳۲]

علی یاسر کی یاد میں امجد اسلام امجد نے بھی "یہ شاعری بھی کیا جادو گری ہے" کے نام سے ایک ریفرنس لکھا، جس سے انھوں نے اپنی محبت اور علی یاسر کے بچھڑنے کے غم کو بیان کیا ہے۔ نیز ان کے ساتھ گزرے وقت کو یاد کیا اور غم کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر فرحت عباس، جنید آزر اور حسن عباس رضا نے بھی تعزیتی ریفرنس لکھا اور ایک باوفا دوست کے بچھڑ جانے کا اظہار کیا۔ حسن عباس رضا کا شعر ملاحظہ ہو:

"جدائی کی رتوں میں صورتیں دھندلانے لگتی ہیں
سو ایسے موسموں میں آئینہ دیکھا نہیں کرتے"[۳۳]

علی یاسر کے بیٹے عمار علی یاسر نے بھی اپنے والد کی وفات پر اپنے دکھ اور اپنے باپ سے محبت کے اظہار میں علی یاسر: ایک خوبصورت انسان ایک عظیم باپ، کے نام سے ریفرنس لکھا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

"بابا میں آپ کا حساس بیٹا تھا۔ ہسپتال سے تدفین تک میں نے بڑا بیٹا ہونے کے تمام فرائض سر انجام دیے، احسان نہیں جتا رہا نہ ہی کوئی شکوہ کر رہا ہوں لیکن کیا حساس بچوں کو ایسا بھی کرنا پڑتا ہے؟ میں آپ کے بعد سب کو دلاسے دیتا رہا، دادا، دادی، ماما چاچو، بہن، بھائی سب کو سنبھالا پر خود اکیلا سنبھل نہیں پاتا۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور دیدارِ حق کو اکیلے چلے گئے، یہ اچھی دوستی نہیں بابا۔"[۳۴]

علی یاسر کے چاہنے والے جہاں ان کے حق میں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام ملنے اور مغفرت کے لیے دعا گو ہوتے ہیں وہیں اللہ پاک سے دعا ہے کہ باپ کے بغیر ان کے معصوم بچے جن دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں اللہ پاک ان میں آسانی پیدا فرمائے اور ان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ج۔ علی یاسر ادبی جہات: اجمالی جائزہ

کسی بھی شاعر یا ادیب کا ادب میں مقام تسلیم کروانے میں اس کی ادبی تخلیقات کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ انہی تخلیقات کی بنا پر ایک ادیب ادب میں اپنا مقام بناتا ہے۔ علی یاسر کو بچپن سے ہی اردو ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کی ادب میں دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بارہ سال کی عمر میں پہلی غزل لکھی تھی۔ جب کہ باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۹۰ء میں کیا۔ آپ شاعری کی ابتدا میں اپنے دادا جان سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ اردو کے حوالے سے سکول میں منعقد ہونے والی مختلف سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ادبی محفلوں میں بھی جاتے۔ اس طرح ان کا ادب کی طرف رجحان مزید بڑھتا گیا اور شاعری ان کے اظہار کا ذریعہ بنتی چلی گئی۔ آپ ادبی حلقوں میں مشاعروں کے لیے بلا ناغہ جاتے تھے۔ نیز ادبی پروگرام، ادبی محفلیں اور ادبی مشاعرے منعقد کروانے میں متحرک رہتے تھے۔ آپ نے ادبی مشاعروں میں شرکت کے لیے بیرونِ ملک سفر کیے اور بہت سے ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ آپ نے ادب میں اپنی الگ شناخت قائم کی اور خوب شہرت پائی۔ بعد ازاں اکادمی ادبیات میں ادب کی خدمت کے لیے ملازمت اختیار کی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ علی یاسر ہمہ جہت شاعر، محقق، نقاد اور مترجم تھے۔

علی یاسر کی شہرت کا باعث ان کی غزل گوئی ہے۔ ان کی غزلیات کے دو مجموعے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ "ارادہ" ۲۰۰۷ء اور دوسرا مجموعہ "غزل بتائے گی" ۲۰۱۶ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوئے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ شاعری کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ جن میں حمد، نعت، سلام و منقبت، گیت، ماہیے اور نظمیں شامل ہیں۔ چھوٹی عمر میں ہی علی یاسر نے خوب شہرت پائی۔ ڈاکٹر محمد حسین سے گفتگو کرتے ہوئے علی یاسر نے کہا کہ:

> " اسلام آباد میں رہتے بیس برس سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ الحمد اللہ لکھاریوں اور شاعروں میں میری پہچان اور شناخت ہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ نظم، حمد، نعت، سلام، منقبت اور مرثیہ بھی لکھتا ہوں۔ اسلامی تہذیب کے گہرے اثرات میری شاعری پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ "[۳۵]

علی یاسر نے بہت سی نظمیں لکھیں جن میں بچوں کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو، ٹیلی وژن سے بھی منسلک رہے۔ مختلف ادبی پروگراموں میں شرکت کے علاوہ ریڈیو پر مختلف پروگرام

بھی منعقد کرتے رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور اے ٹی وی کے لیے سکرپٹس، دستاویزی فلمیں اور ملی نغمے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے مختلف چینلز پر پروگراموں کی نظامت بھی کرتے رہے۔ بطور محقق خدمات سر انجام دیں جن میں ایم فل کا مقالہ "کلیات منظور عارف تحقیق و تدوین" اور پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا کے نام سے شامل ہے۔ ان کی تحقیقی کتاب "اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا" نیشنل بک فاؤنڈیشن سے ۲۰۲۰ء میں شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے بہت سے تحقیقی و تعارفی مضامین بھی لکھے۔ تحقیقی مضامین میں "منظور عارف کی شاعری میں سماجی طرز احساس اور ترقی پسندی"، تحقیق میں فرضیے کی اہمیت، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: "ایامِ گزشتہ کے چند اوراق" کے آئینے میں، "اردو شاعری اور شہیدِ کربلا"، کتب راشد شناسی شامل ہیں۔ جبکہ تعارفی مضامین میں "نظریات فن و جمال از ڈاکٹر اقبال آفاقی"، اکادمی ادبیات پاکستان: ایک تعارف، اخبار اردو ۳۰ سالہ سفر کی کہانی، نعتیہ محفلِ مشاعرہ شامل ہیں۔ مترجم کی حیثیت سے انگریزی اور پنجابی سے اردو میں کئی شعری اور نثری تراجم بھی کیے۔ شعری تراجم میں چین کی محبت کی نظمیں اور ہائیکو جبکہ نثری تراجم میں الیاس گھمن کا افسانہ اگلا بندہ امرتا پریتم کے افسانے: مترا، سفید دھوتی۔۔زری کا کفن، امروز، نوبیل لیکچر شامل ہیں جو اکادمی ادبیات کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جان کیٹس کی نظم (La Belle Dame Sans Merci) کا منظوم ترجمہ "حُسن کی بے رحم ملکہ" کے نام سے کیا جو کہ ابھی تک کہیں بھی شائع نہیں ہوا۔ علی یاسر نے پاکستان ائیر فورس کے لیے "اونچی اُڑان" کے نام سے ایک قومی ترانہ لکھا۔ جو ۲۰۱۸ء میں ریلیز ہوا۔ انھوں نے اکادمی ادبیات میں بطور افسر مطبوعات بھی خدمات انجام دیں۔ آپ کی زیرِ نگرانی کئی کتب تدوین اور طباعت کے مراحل سے گزریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ادب اشارہ انٹرنیشنل تنظیم کے صدر بھی رہے۔ علی یاسر نے اہلِ قلم ڈائریکٹری ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۰ء مرتب کی۔ جن میں تمام ادبی شخصیات کے کوائف کو اکٹھا کر کے شائع کیا گیا۔ یہ اکادمی ادبیات کے لیے آپ کی ایک اچھی اور محنت طلب کاوش تھی۔ ڈاکٹر جنید آزر کے مطابق:

> "علی یاسر نے اکادمی ادبیات کے لیے اہلِ قلم ڈائریکٹری مرتب کرتے ہوئے ادبی شخصیات کے کوائف انتھک محنت سے یکجا کیا۔ وہ اکادمی ادبیات کا ایک متحرک اور فعال آفیسر تھا، جو اپنے فرائضِ منصبی نہایت خوشحالی اور محنت سے ادا کرتا رہا۔"[۳۶]

علی یاسر کی بہت سی ایسی نظمیں اور گیت بھی ہیں جن کی ابھی تک اشاعت نہیں ہوئی۔ ان میں "بھکاری بچے"، "نذرِ وطن"، "کشمیری سونگ"، ایک نظم "قائد کے لیے" اور "میجر عزیز بھٹی شہید" کے لیے لکھی۔ اس کے علاوہ "فروری لوٹ جا"، "سنو سنو مجھے کچھ کہنا ہے" اور "خواب دشمن ہیں" شامل ہیں۔ انھوں نے مختلف کالجوں میں بین الجامعاتی مقابلوں میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ آئی ایم سی جی، آئی ایٹ فور، کالج اسلام آباد کے لیے انھوں نے ترانہ آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور، اسلام آباد کے نام سے نظم پیش کی جو اس مقالے کے آخر میں ضمیمے کے طور پر لگائی گئی ہے۔ ان کی زیرِ طبع کتب میں "ذکرِ رسولِ عربی (اردو نعتیہ مجموعہ)، "بے ارادہ" (غزلیہ مجموعہ) اور "چکڑ دے وچ ہار" (پنجابی شاعری) شامل ہیں۔ علی یاسر دن رات کی محنت، لگن، ایمانداری اور ادب میں قیمتی سرمائے کی وجہ سے آج ہر دل عزیز ہیں نیز کم عمری میں ادب میں اعلیٰ مقام بنانے میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ معاصر ادیبوں میں انہیں اسی بنیاد پر شہرت ملی۔

د۔ معاصر ادبی روایت کا مطالعہ

انسان کی زندگی پر حالات وواقعات کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور یہ اثرات ہمارے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ادیب حساس طبعیت کا مالک ہوتا ہے اور وہ اپنے ارد گرد میں ہونے والے واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہوئے ادب تخلیق کرتا ہے۔ ادب کی دو اصناف ہیں۔ نثری ادب اور شعری ادب۔ شعری ادب میں غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، منقبت اور نعت وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ نثری ادب میں ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ، سفر نامہ، آپ بیتی، سوانح، مثنوی وغیرہ شامل ہیں۔

برطانوی راج کے خاتمے کے بعد زندگی کے باقی شعبوں کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ تقسیم کے حوالے سے جو توقعات آزادی اور امتِ مسلمہ سے منسوب ہو چکی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں اور لوگوں میں مایوسی پھیلنا شروع ہو گئی۔ اس عہد کی شاعری ان ناتمام حسرتوں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ اس عہد کے شعر امثلاً ساحر لدھیانوی، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے ہاں ایک طرف تو آزادی سے منسوب امیدیں دم توڑتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف ہجرت اور اس سے پیدا شدہ مسائل ان کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ان حالات کی منظر کشی اس انداز میں کرتے ہیں۔

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے

ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

(احمد ندیم قاسمی)

فیض احمد فیض حالات کی ابتری اور ملکی معاملات کو دیکھتے ہیں تو ان کا دل درد کی شدت سے بھر جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

(فیض احمد فیض)

اسی طرح ناصر کاظمی کے ہاں ہجرت کے بعد کچھ کھو جانے کا احساس اور اپنوں سے بچھڑ جانے کا دکھ بہت شدت سے ملتا ہے۔ ان کے ہاں نقل مکانی ایک بہت بڑا المیہ اور اپنے قریبی رشتوں کو چھوڑ کر نئی زندگی کا آغاز کرنا بہت اہم مسئلہ رہا۔

آج ان رستوں پہ تنہائی کی دھول اڑتی ہے

جو تیرے نقشِ کفِ پا سے سجا کرتے تھے

(ناصر کاظمی)

معاصر اُردو غزل کا منظر نامہ قیام پاکستان کے احیا کے ساتھ ہی اپنے رنگ و روپ نکھارنے لگ گیا تھا۔ آزادی کی تحریک، پاکستان کے قیام، فسادات، ہجرت اور آزادی کے بعد کے نئے وطن کے خوابوں کی تعبیر نے تخلیق کاروں کو بھی متاثر کیا۔ قیامِ پاکستان کی غزل میں بے یقینی، خواب ٹوٹنے کا کرب، ہجرت کا دکھ، ناامیدی اور مایوسی وغیرہ کے خدوخال نمایاں رہے۔

تقسیم کے بعد ادب کی دیگر اصناف مثلاً افسانہ اور ناول وغیرہ میں بھی ہجرت کے دکھ اور مصائب کا احوال ملتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے حالات سنگین ہوتے گئے اردو ادب کے بنیادی موضوعات میں قتل وغارت، قافلوں کا لٹ جانا، اپنے عزیزوں کے بچھڑنے، بے گھر ہونے کے غم جیسے موضوعات شامل ہو گئے۔ بعد ازاں پے در پے فوجی حکومتوں نے ملک پر قبضہ کیے رکھا تو ادب کی ہر صنف میں اس طرزِ حکومت

کے خلاف ڈھکے چھپے الفاظ میں اور بعد ازاں واضح طور پر بغاوت نظر آنے لگی۔اسی دوران مختلف تحریکوں مثلاً ترقی پسند تحریک وغیرہ نے دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ترقی پسند تحریک نے جن موضوعات کو بنیاد بنایا ان میں معاشی بدحالی، آزادی، غلامی اور سیاسی حالات وغیرہ شامل تھے۔بقول ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد:

> "ترقی پسند شاعروں نے تحریک کے مقاصد کے تحت معاشرتی جبریت کو نشانہ بنایا۔ غلامی، استحصال اور ظلم و ستم کے خلاف آواز اُٹھائی۔ تحریک کے مقاصد کی ترسیل کے لیے نظم کو غزل پر ترجیح دینے کا رجحان اُبھرا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ نظم میں نظریے کو زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ پیش کرنا ممکن ہے۔"(۳۷)

ترقی پسند تحریک کے بعد حلقۂ ارباب ذوق ایک ادبی تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔اس تحریک نے اپنا نظریہ قارئین تک پہنچانا شروع کیا۔اس تحریک سے فیض احمد فیض سے لے کر بیسویں صدی کے آخری حصے تک ادیب متاثر رہے۔اس تحریک کا مقصد سماج اور جدید اقدار کے تحت موضوع کو آزادی دلانا تھا۔اس حوالے سے حمیدہ شاہین لکھتی ہیں کہ:

> "حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا نے فرد کی نفسیاتی اور داخلی الجھنوں کو شاعری میں اظہار کا راستہ بنایا۔ ان شعرا نے ابتدا میں بے شک نظم کو زیادہ اہمیت دی لیکن یہ حقیقت میں شعری تصور غزل پر زیادہ منطبق ہوتا ہے۔۔۔ حلقۂ ارباب ذوق کے نزدیک جدت اور انفرادیت کو طریقِ اظہار میں بھی اپنا وجود منوانا تھا۔۔۔ آج اکیسویں صدی کی غزل پر بھی بجا طور پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔"(۳۸)

ہر دور کی طرح اس عہد کی تحریکوں نے بھی کچھ عرصہ تیزی سے اپنا اثر دکھانے کے بعد معدومیت کی راہ لی۔اس دور میں شاعری کی دنیا میں بڑی تعداد میں معتبر نام سامنے آئے۔ نیز فن برائے زندگی اور فن برائے فن کے نظریات کے تحت کام کرنے والوں کی بڑی تعداد نے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ نظم میں آزاد نظم کے علاوہ ہیئت اور موضوع کے تجربات کرنے والوں میں تصدق حسین خالد، میرا جی، ن۔م۔راشد اور مجید امجد نے اپنا الگ رنگ قائم کیا۔ نظم کے ساتھ نثری نظم کے تجربے بھی کیے گئے۔ ظفر

اقبال نے غزل میں لسانی تجربے کیے۔ عبید اللہ علیم، عبد الحمید عدم، قتیل شفائی، سیف الدین سیف، فراق گورکھ پوری، صوفی تبسم، ابنِ انشاء، افتخار عارف، جون ایلیاء، جمال احسانی، محسن نقوی، منیر نیازی، مصطفیٰ زیدی اور بشیر بدر نے بھی اپنی اپنی الگ شناخت قائم کی۔

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

(افتخار عارف)

۵۰ اور ۶۰ کی دہائی کی غزل میں جدید غزل کا لہجہ سامنے آیا۔ تحریکوں کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ملی اور قومی شاعری کا عروج نظر آتا ہے۔ اس دور میں لکھے گئے ملی ترانوں جیسے عمدہ ترانے بعد میں تحریر نہیں کیے جا سکے۔ مارشل لاء کے ادوار اور خصوصی طور پر ۷۰ کی دہائی میں سقوطِ ڈھاکا کی وجہ سے جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کا نوحہ لسانی تشکیلات کی تحریک، علامتی انداز اور تمثالی اسلوب کو فروغ ملا۔ مذہبی علامتوں اور تمثالوں کو غزل میں برتا جانے لگا اور جو خلیج ذہنوں اور دلوں میں حائل ہوئی اس کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس دور کی غزل میں تہذیبی بازیافت کی تصویر کشی تواتر سے نظر آتی ہے۔ طارق ہاشمی اس حوالے سے رقم طراز کرتے ہیں:

"۱۹۷۰ء کے بعد اردو غزل نئے اسلوب میں ایک ایسے امتزاج کی تشکیل کی ابتدا ہوئی جس میں قدیم و جدید ہر دو تخلیق رنگوں کی آمیزش تھی۔ ۷۰ کی دہائی میں ظہور پذیر ہونے والی نئی نسل نے جہاں روایت کی اہمیت کو تسلیم کیا وہاں ۶۰ کی دہائی کے جدید شعری نظریات سے بھی بڑی بالغ نظری سے استعادہ کیا۔ اس عمل سے وسیع، کشادہ اور جہت نما راستے کی ایک واضع اور اہم شکل جن شعرا کے ہاں نظر آتی ہے اُن میں شبیر شاہد، ثروت حسین، افتخار عارف، عرفان صدیقی، عدیم ہاشمی، صابر ظفر جلیل عالی وغیرہ کا شعری اسلوب نمایاں ہے۔"[۳۹]

ان ادوار میں قید و بند کی سختیاں برداشت کرنے والے ادیبوں کے ہاں قاتل، تلوار، قلم، زنداں اور تاریکی سے لڑتے چراغ اور ستاروں کی علامتیں بہت زیادہ استعمال ہونے لگیں۔ اس دور میں مزاحمتی ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ سامنے آیا اور حبیب جالب اور احمد فراز جیسے بڑے نام سامنے آئے۔ اس کے ساتھ فیض احمد

فیض، احمد فراز اور کئی ادیبوں نے جلاوطنی اختیار کی۔ اس دور میں وطن سے دوری اور لیلائے وطن کی زلفوں کی پریشانی کے نوحے لکھے گئے۔

ادا جعفری ، پروین شاکر ،زہرا نگاہ، کشور ناہید، نوشی گیلانی جیسی توانا آوازوں نے عورت کے احساسات اور اس کی تکالیف کا بڑے متاثر کن انداز میں بیان کیا۔ پروین شاکر نے متعدد حوالوں سے گھریلو اور دفتری امور میں پھر مزدوروں تک کے حالات پر نظمیں تحریر کیں۔ احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، فیض اور تنویر سپرا نے عام انسان کے معاشی استحصال پر خامہ فرسائی کی۔ مزاح میں انور مسعود، ڈاکٹر جاوید اقبال، ضمیر جعفری، دلاور فگار نے اردو کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ ماہر القادری، مظفر وارثی جیسے نام نعتیہ شاعری اور واصف علی واصف تصوف کے حوالے سے عظیم نام ہیں۔ اکیسویں صدی میں عابد ادیب، عابد جعفری، آفاق اسیری، عامر ریاض، عارف اختر نقوی، عاصی فائقی، عباس رضوی، عباس تابش، فرحت عباس شاہ جیسے نام موجود ہیں۔

۸۰ اور ۹۰ کی دہائی کی غزل میں جدید تر اُردو غزل کا لہجہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان کے قیام سے لے کر موجودہ دور تک پاکستانی غزل طویل ارتقائی سفر طے کر چکی ہے۔ موجودہ دور میں بھی یہ گل و بلبل، مینا، جام، محبوب کے فرضی خیالات کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے۔ عصرِ حاضر کے غزل گو شعرا نے غزل میں صحرا، سمندر، دیوار اور طوفان وغیرہ جیسی نت نئی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔ علاقائی ادب کے ساتھ عالمی ادب کے اثرات بھی اردو ادب پر واضح طور پر ملتے ہیں۔ نہ صرف عالمی ادب کے اثرات اردو ادیبوں کے ہاں ملتے ہیں بلکہ متعدد شعرا نے کشمیر کے علاوہ بیروت، کانگو، ویتنام، فلسطین کے حالات پر بھی اپنے احساسات و جذبات کا اظہار بھی کیا۔

بیسویں صدی کے آخر تک جو شعر و ادب کا عروج تھا وہ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ ادب کے عظیم ناموں کی ایک کھیپ رخصت ہوئی جس کے بعد مشاعروں کی روایت بھی دم توڑنے لگی۔ اس دور کی غزل میں جدید صنعتی اور مشینی دور کے مسائل، تنہائی، نفسیاتی الجھنوں کو غزل میں برتا گیا۔ اس دور کی غزل نئے لحن اور تازگی کے باعث ایک شناخت رکھتی ہے۔ اس کی غزل میں کلاسیکی و جدیدیت کا امتزاج اور موضوعاتی کشادگی اور فنی بصیرت بھی منفرد سطح پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ دہشت گردی اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے کتب بینی میں نمایاں کمی کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا چرچا بھی کم کر دیا۔ ایمن تنزیل کے مطابق:

"ہر دور کی طرح آج کا زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔ آج بدلتے ہوئے حالات نے غزل کو بھی نئے تصورات اور خیالات سے آشنا کیا۔ پرانی روایت کی جگہ جدت طرازی نے لے لی ہے۔ نئ اشاریت اور نئ رمزیت کا دور دورہ ہے۔"[۴۰]

اس دور کے اہم شعرا میں اختر عثمان، عباس تابش، آفتاب حسین، ارشد محمود ناشاد، عابد سیال، شاہین عباس، سعود عثمانی، محسن چنگیزی، شناور اسحاق اور علی یاسر نمایاں ہیں۔

اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں شعری ادب میں بہت نکھار اور جدت آئی ہے۔ اس دور کی شاعری میں سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور روحانی کیفیات کے تغیر کو نئے لحن اور نئ لفظیات کے ساتھ تخلیقات کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس حوالے رضیہ پروین کا کہنا ہے کہ:

"انسان کے ذوق نظر اور نقطہ نظر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ اس جدوجہد کی کہانی ہیں جو سماج کی بڑھتی پھلتی ہوئی ضرورتوں میں توازن قائم کرنے کے لیے خود انسانوں نے ہی کی ہے۔ آج کے الیکٹرونک ماحول نے ہر شعبے میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ سائنس، آرٹ، تصورات جنسی تعلقات ہر جگہ شعوری اور غیر شعوری طور پر تبدیلیاں نظر آرہی ہیں ایسے میں ان تغیرات کا اثر شاعری میں ہونا لازمی ہے کیونکہ شاعر کے احساس وخیالات بھی ان سے اچھوتے نہیں یہی وجہ ہے کہ بیشتر شعرا کے یہاں جدید انداز اور نئے تصورات کا اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔"[۴۱]

اس دور کی غزل میں بہت سے نئے شعرا نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اختر عثمان نے اپنے شعری مجموعے "ابد تاب" اور کچھ بچا لائے ہیں، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے "رنگ"، عابد سیال نے "بے ستوں" ادریس بابر نے "یونہی"، عباس تابش نے "آسماں" جنید آزر نے "کشف"، طاہر حنفی نے "گونگی ہجرت"، خانہ بدوش آنکھیں" کے ذریعے جدید غزل کو نئے اسلوب سے آشنائی بخشی ہے۔

اکیسویں صدی کی غزل کے موضوعات میں سیاسی، سماجی موضوعات کے ساتھ نفسیاتی موضوعات کو بھی برتا گیا ہے۔ عائلی زندگی کے مسائل، ٹیکنالوجی کا استعمال، بے سکونی، اور دہشت گردی جیسے واقعات کے

اثرات بھی غزل کا موضوع بنے ہیں۔ اسی دور کی غزل میں نیا اور منفرد لب و لہجہ اور نرم و گداز زبان بھی شعری ادب کو نئی توانائی بخشتی ہے۔ڈاکٹر قیام نیر کے مطابق:

"اکیسویں صدی کا عہد کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئی نئی ٹیکنالوجی، ٹیلی وژن، موبائل، انٹرنیٹ (فیس بک، واٹس ایپ، ٹویٹر) وغیرہ جیسے جدید ذرائع ابلاغ نے انسان کے دل و دماغ اور ذہین احساس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے رنگ ڈھنگ ہی کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ اکیسویں صدی کے شعرا نے زیادہ تر موضوعات کو نئے اسلوب اور نئے انداز سے برتا ہے۔"[۴۲]

اس دور کی غزل کسی نظریے یا رجحان کا باعث تو نہیں بنی مگر اس میں توانائی اور امکانات ضرور موجود ہیں۔ جدید غزل، کلاسیکی و جدت کا امتزاج لیے ہوئے ہے۔

ادریس بابر کی شاعری میں اپنی ذات کی بے بسی اور تنہائی کی کیفیات خاص طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ادریس بابر معاصر غزل کا نمائندہ شاعر ہے جس کے ہاں جدید مشینی اور مصروف زندگی کا بھرپور سماجی شعور بھی نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کی مشکلات اور سعیٔ حیات کے ساتھ ساتھ عشقی کیفیات کی کش مکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ سماج کی تلخ حقیقتوں سے منہ نہیں موڑتے اور حقیقت کا سامنا کرتے ہیں۔

تیری آنکھوں پہ میرا خوابِ سفر ختم ہوا
جیسے ساحل پہ اُتر جائے سفینہ میرے دوست

(ادریس بابر)

تو بھی ہو، میں بھی ہوں اِک جگہ پر اور وقت بھی ہو
اتنی گنجائشیں رکھتی نہیں دنیا میرے دوست

(ادریس بابر)

عابد سیال کی غزل گوئی میں بھی معاصر ادبی فضا، سیاسی و سماجی منظر نامہ اور جمالیاتی ذوق کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان کی غزل میں فرد کی داخلی زندگی کی کیفیات، خارجی زندگی کے مسائل اور تنہائی کی الجھنیں اور زندگی کے احساسِ محرومی کو تخلیقی سطح پر غزل میں برتا گیا ہے۔ عابد سیال کی غزل بھی معاصر عصری و سماجی رویوں کی عکاس ہے۔ انہوں نے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو فنکارانہ سطح پر تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

کفِ خزاں پہ کھلا میں اس اعتبار کے ساتھ
کہ ہر نمو کا تعلق نہیں بہار کے ساتھ

(عابد سیال)

قاسم یعقوب کا شمار بھی اکیسویں صدی کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور فرد کی داخلی و خارجی کیفیات کی آئینہ دار ہے۔ قاسم یعقوب کے ہاں بھی معاصر سماجی رویوں کا اظہار بھی فنکارانہ اور تخلیقی سطح پر ملتا ہے۔ جدید مشینی زندگی، منافقت اور دہرا معیار ان کی شاعری میں بھی موضوع بنتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ " دیکھ چکا میں موج موج " جمالیاتی ذوق اور سماجی مشاہدے کا خوبصورت تخلیقی اظہار ہے۔

یہ جھانک لیتی ہے اندر سے آرزو خانہ
ہوا کا قد میری دیوار سے زیادہ ہے

(قاسم یعقوب)

میں متقی ہوں مگر حوصلہ گناہوں کا
میرے بدن میں گناہگار سے زیادہ ہے

(قاسم یعقوب)

شاہد ذکی بھی علی یاسر کے معاصر شعرا میں سے ایک ہیں۔ ان کے ہاں بھی عصری اور سماجی شعور کی عکاسی ہنروری کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں بھی جھوٹ، منافقت، دھوکہ دہی، غربت اور دہرے معیار کو سلیقے سے برتا گیا ہے۔

ایسا بدلا ہوں تیرے شہر کا پانی پی کر
جھوٹ بولوں تو ندامت نہیں ہوتی مجھ کو

(شاہد ذکی)

یار بھی راہ کی دیوار سمجھتے ہیں مجھے
میں سمجھتا تھا میرے یار سمجھتے ہیں مجھے

(شاہد ذکی)

شناور اسحاق کا شمار بھی جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل منفرد اور اچھوتے طرزِ احساس کا نمائندہ ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کو پرکھنے کا ڈھنگ، روحانی اور آفاقی طرزِ احساس کو جنم دیتا ہے۔ ان کی شاعری فرد کی داخلی اور خارجی کیفیات کے امتزاج کو نمایاں کرتی ہے۔

لوگ سو جائیں تو رُکتا نہیں باتوں کا سفر

رات ہو جائے تو آپس میں مکاں بولتے ہیں

(شناور اسحاق)

یہ جا کے دھان کی خوشبو سے پوچھیے، صاحب

ہمارا گاؤں سے آنا بھی ایک واقعہ ہے

(شناور اسحاق)

معاصر ادب میں شعر و نثر کے اندر موضوعاتی تنوع قابلِ توجہ ہے۔ اس دور میں فرد کی داخلی اور خارجی زندگی مشینی، ٹیکنالوجی، سیاسی، سماجی اور عصری مسائل کی وجہ سے بہت متاثر ہوئی۔ اس دور کے تخلیق کاروں نے مادی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ روحانی سکون کی تلاش کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس دور کے سماجی رویوں میں ایک طرف خوف، دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور سیاسی شعور کے موضوعات سامنے آئے تو دوسری طرف منافقت، جھوٹ، دھوکہ دہی، بے یقینی و بے اعتباری، غربت اور نوکر شاہی کے موضوعات بھی معاصر شاعری کا حصّہ بنے ہیں۔ معاصر ادب میں چاہے وہ نثر تخلیق کرنے والا ہو یا شاعر ہو، جدید دور کے انسان کی تنہائی، ان کو درپیش المیوں، زندگی اور موت کی بدلتی معنویت، بے معنی زندگی کے احساس، مشینی زندگی کے فوائد اور نقصانات اور انسانی مصائب کو محسوس کرتے ہوئے بہتر انداز سے اردو ادب میں پیش کیا ہے۔

علی یاسر کی شاعری میں بھی اس کے معاصر شعرا کی طرح سماج کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی ملتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے عصری و سماجی رویے ان کی شاعری میں بھی معاصر شعرا کی طرح نمایاں نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ انھوں نے اس تبدیل ہوتی ہوئی جدید دور کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو) مطبوعہ: ماہنامہ نیارخ، کراچی، جولائی، ۲۰۱۸، ص ۲۰

۲۔ حبیب حیدر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱نومبر ۲۰۲۰ء بوقت چار بجے دن

۳۔ ایضاً

۴۔ شازیہ علی، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱۵ستمبر ۲۰۲۰ء بوقت پانچ بجے دن

۵۔ ایضاً

۶۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو)، ص ۲۰

۷۔ حبیب حیدر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱نومبر ۲۰۲۰ء بوقت چار بجے دن

۸۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو)، ص ۲۰

۹۔ شازیہ علی، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱۵ستمبر ۲۰۲۰ء بوقت پانچ بجے دن

۱۰۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو) مطبوعہ، ص ۲۰

۱۱۔ جنید آزر، ڈاکٹر، ہم ایک ساتھ بہت سجتے تھے: (علی یاسر کے حوالے سے کچھ بکھری بکھری یادیں)، مطبوعہ: نقاط، شمارہ۔۱۷، ۲۰۲۰ مئی، سٹی بک پوائنٹ، کراچی ص ۳۹۴

۱۲۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو)، ۲۰۱۸، ص ۲۰

۱۳۔ جنید آزر، ڈاکٹر، ہم ایک ساتھ بہت سجتے تھے (علی یاسر کے حوالے سے کچھ بکھری بکھری یادیں)، مطبوعہ: نقاط، ص ۳۹۵

۱۴۔ حبیب حیدر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱نومبر ۲۰۲۰ء بوقت چار بجے دن

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو) مطبوعہ: ماہنامہ نیارخ، ص ۲۰

۱۷۔ شازیہ علی، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱۵ستمبر ۲۰۲۰ء بوقت پانچ بجے دن

۱۸۔ عمار علی یاسر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۲۵ ستمبر ۲۰۲۰ء بوقت تین بجے دن

۱۹۔ جنید آزر، ڈاکٹر، ہم ایک ساتھ بہت سجتے تھے (علی یاسر کے حوالے سے کچھ بکھری بکھری یادیں)، مطبوعہ: نقاط، ص ۳۹۵

۲۰۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو) مطبوعہ: ماہنامہ نیارخ، ص ۲۰

۲۱۔ شازیہ علی، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱۵ ستمبر ۲۰۲۰ء بوقت پانچ بجے دن

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو) مطبوعہ: ماہنامہ نیارخ، ص ۲۰

۲۴۔ حبیب حیدر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ا نومبر ۲۰۲۰ء بوقت چار بجے دن

۲۵۔ جنید آزر، ڈاکٹر، ہم ایک ساتھ بہت سجتے تھے (علی یاسر کے حوالے سے کچھ بکھری بکھری یادیں)، مطبوعہ: نقاط، ص ۳۹۶

۲۶۔ حسن عباس رضا، خوبصورت جذبوں کا امین: علی یاسر، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۴

۲۷۔ جلیل عالی، بیادِ علی یاسر، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۶

۲۸۔ ایضاً ص ۳۷۶

۲۹۔ جلیل عالی، بیادِ علی یاسر، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۷

۳۰۔ علی اکبر عباس تعزیتِ علی یاسر، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۸

۳۱۔ جمیل قمر، یاد کا استعارہ: علی یاسر، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۸

۳۲۔ نسرین سید، علی یاسر کے لیے ایک نظم، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۹

۳۳۔ حسن عباس رضا، خوبصورت جذبوں کا امین: علی یاسر، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۴

۳۴۔ عمار علی یاسر علی یاسر: ایک خوبصورت انسان، ایک عظیم باپ، مطبوعہ نقاط، ص ۳۷۵

۳۵۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ادبی دنیا، (انٹرویو) مطبوعہ: ماہنامہ نیارخ، ص ۲۰

۳۶۔ جنید آزر، ہم ایک ساتھ بہت سجتے تھے (علی یاسر کے حوالے سے کچھ بکھری بکھری یادیں)، مطبوعہ نقاط، ص ۳۹۵

۳۷۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر اُردو غزل کا تکنیکی، ہئیتی اور عروضی سفر، مجلس ترقی اُردو ادب، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۱۹۸

۳۸۔ حمیدہ شاہین، مطالعہ (مضامین)، پیس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰، ص ۴۷

۳۹۔ طارق ہاشمی، اُردو غزل – نئی تشکیل زیرو پوائنٹ پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۰۸، ص ۲۹۱

۴۰۔ ایمن تنزیل، اکیسویں صدی اور اردو غزل: مختصر جائزہ (مضمون) مشمولہ: اکیسویں صدی میں اردو غزل، مرتبہ ڈاکٹر منصور خوشتر، نیو پرنٹ سینٹر، نئی دہلی، ص ۲۲۵

۴۱۔ رضیہ پروین، اکیسویں صدی اور غزل کے بدلتے انداز (مضمون) مشمولہ: اکیسویں صدی میں اردو غزل، ص ۲۲۰

۴۲۔ قیام نیر، ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں بہار کی غزلیہ شاعری (مضمون) مشمولہ: اکیسویں صدی میں اردو غزل، ص ۱۳۵

باب دوم

علی یاسر کی شاعری: تجزیاتی مطالعہ

الف۔ علی یاسر کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ

معاشرے اور ادب کا ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ادب معاشرے کی ترقی اور نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ادب معاشرے کی رہنمائی کا سبب بنتا ہے۔ادیب معاشرے کے تمام مسائل کا باریکی سے مشاہدہ کرتا ہے اور ادب تخلیق کرتا ہے۔ادب ہی کی وجہ سے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔اسی لیے ادیب کو معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ادب کی ایک اہم صنف شاعری ہے۔ شاعری انسان کے خیالات، جذبات و احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔شاعر حساس ہوتا ہے۔اس کے گرد و پیش میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اس کی ذات، احساسات سوچ اور فکر کو متاثر کرتے ہیں۔خارج کے یہ ہنگامے اس کی داخلی دنیا میں ہلچل مچاتے ہیں اور داخل کا کرب لفظوں کی صورت میں قاری کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچاتا ہے۔وہ ان مسائل کو اپنے لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ناانصافی، ظلم و ستم، رنگ و نسل جیسے معاشرتی مسائل ہمارے ہر دور کے ادب کا موضوع بنتے رہے ہیں۔اکیسویں صدی میں بدلتے ہوئے تناظر اور حالات نے شاعری کو ایک نئی جہت دی۔ فکری سطح پر شاعر متاثر ہوا اور شاعری کے موضوعات کو وسعت ملی۔جس طرح تاریخ میں بہت سے مشہور شعرا سامنے آئے اسی طرح اکیسویں صدی میں بھی بہت سے شعرا نے اپنے گرد و پیش میں ہونے والے واقعات کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔علی یاسر کا شمار بھی دورِ حاضر کے جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی غزلیات کے دو مجموعے "ارادہ" اور "غزل بتائے گی" شائع ہو چکے ہیں۔علی یاسر ایک تخلیق کار کی حیثیت سے سامنے آئے اور اپنے گرد و پیش میں ہونے والے حالات و واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ان کی غزلوں کے موضوعات میں رومانویت، غربت و افلاس، سماجی رویے، زندگی کی بے ثباتی، عاجزی، بے بسی، آزمائش، وطن سے محبت، فنا و بقا وغیرہ شامل ہیں۔

علی یاسر کا شمار موجودہ دور کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی غزل گوئی اپنی فکر کے اعتبار سے تنوع کی حامل ہے۔ان کی غزل میں روایتی اور کلاسیکل غزل کا رچاؤ بھی جھلکتا ہے اور جدید معاصر غزل کے

موضوعات بھی ان کی شاعری کی شناخت قائم کرتے ہیں۔ اُن کی غزل میں روایتی موضوعات کو جدت آمیز طریقے سے غزل میں برتا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں نہ صرف ان کی اپنی ہی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے بلکہ اس زمین پر بسنے والے ہر انسان کا دُکھ ان کے سینے میں ہی دفن محسوس ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے علی یاسر کی کتاب "غزل بتائے گی" کی تقریب پذیرائی کے موقع پر صدام ساگر نے ان کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:

"غزل کیا بتائے گا علی یاسر

محبت سے سنائے گا علی یاسر

ادب کے آسماں کا وہ ستارہ ہے

ہمیشہ جگمگائے گا علی یاسر"(1)

ان کی شاعری میں حمدیہ اور نعتیہ کلام بھی ملتا ہے۔ ان کے حمدیہ اور نعتیہ کلام میں الفاظ کا چناؤ اور خیالات کا اظہار سلیقے کے ساتھ موجود ہے۔ علی یاسر کی غزل گوئی میں تصوف کا رنگ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری ایک باشعور اور عصری شعور کے حامل شاعر کی شاعری ہے۔ انھوں نے روایتی موضوعات خصوصاً محبت، نفرت، ہجر وصال، تصورِ فنا و بقا، تصورِ غم، عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی اور فلسفیانہ خیالات کو خوش اسلوبی سے غزل میں برتا ہے۔ علی یاسر کے دونوں شعری مجموعے "ارادہ" اور "غزل بتائے گی" ان کی شاعری کے خیالات اور موضوعاتی تنوع کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ گو وہ خود کم بولتے تھے مگر ان کی غزلیات پڑھ کر لگتا ہے کہ ان کی غزلیات بہت بولتی ہیں۔ علی یاسر کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ان کی فکری تابندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں رومانویت کا رنگ بہت غالب ہے۔ آپ شعر کو زندگی اور زندگی کو شعر کہہ کر پکارنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اپنے کہے گئے اشعار کو اپنی مکمل کمائی سمجھتے ہیں۔ علی یاسر کے شعری نظام میں رومانوی لب ولہجہ ایک مخصوص اسلوب اور خیالات کو تشکیل دیتا ہے۔ بے ثباتی کا رویہ بھی ان کی تفکر آمیزی کو نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

رومانویت

رمانویت (رومانیت) کا لفظ "رومان" سے نکلا ہے۔ رومانویت کے لیے انگریزی میں Romanticism"کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس سے مراد عشق و محبت اور تخیلات پر مبنی فرضی داستانیں، افسانے، ناول اور نظم شامل ہیں۔

فیروز اللغات کے مطابق: "رومان ادب کی وہ صنف ہے جس میں حقیقی زندگی سے غیر متعلق واقعات بیان کیے جائیں"۔ (۲) رومانویت ادب میں ایک ایسا انداز بیان ہے۔ جس میں فکر سے زیادہ انسان کے تخیلات، جذبات اور کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔

کشاف تنقیدی اصلاحات میں رومانویت کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

> " جوش و جذبات کا بے ساختہ اظہار، فطرت پرستی اور نرگسیت ہے۔ انفعالی رومانویت جو زندگی کی تلخ حقائق ایک قسم کا فرار ہے اور عملی رومانویت جو زندگی کی تلخیوں کو دور کرنے کے لیے عزم و استقلال بخشتی ہے"۔ (۳)

رومانویت کا لفظ رومانس "Romance" سے نکلا ہے۔ اس سے مراد جذبات کا بلا تکلف اظہار، فطرت پرستی، جوش و شدت، سیاسی اور معاشرتی قید کے خلاف بغاوت، وجدان اور تخیلات کا اظہار ہے۔ ادبی اصطلاحات کا تعارف میں ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> "رومانس کی اصطلاح ایسے منظوم یا منثور قصے کے لیے استعمال ہوتی تھی جس کے مناظر و واقعات حقیقی زندگی کے مناظر و واقعات سے ہٹے ہوئے ہوں۔"(۴)

رومانس زندگی کی حقیقت کے بجائے تخیلات پر مبنی واقعات کا بیان ہے۔ محمد حسن کتاب اردو ادب میں رومانوی تحریک میں رومانویت کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "رومان کا لفظ رومانس سے نکلا ہے اور رومانس زبانوں میں اس قسم کی کہانیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو انتہائی پر شکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر وسطی کے جنگ جو اور خطر پسند نوجوانوں کے مہمات سے متعلق ہوتی تھیں اور اس طرح اس سے خاص تین مفہوم وابستہ ہو گئے"۔

۱۔ عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔

۲۔ غیر معمولی آراستگی، شان و شکوہ، آرائش، فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانوی کہنے لگے۔

۳۔ عہد وسطی سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانویت کا لقب دیا گیا۔ "(۵)

رومانویت دراصل ایک ادبی تحریک ہے جس کی ابتدا یورپ کے ایک مفکر روسو نے کی اور اردو ادب میں یہ سرسید کی تحریک کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی۔ اس انقلابی تحریک کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ سرسید تحریک میں عقل، مقصد اور حقیقت نگاری پر زور دیا گیا، جذباتی اور رومانوی پہلووؤں کو نظر انداز کیا گیا۔ رومانوی ادیبوں نے مقصدیت اور عقلی ادب کے خلاف بے حد احتجاج کیا اور ادب کے لیے نت نئی راہیں ہموار کیں۔ رومانوی ادیب نے معاشرے کے اصولوں سے بغاوت کی، معاشرے کی بے جا پابندیوں کو توڑا، اور انسان کو ہر طرح کی قید سے آزادی دلوائی۔ حقیقت نگاری کے بجائے تخیل اور جذبات و احساسات پر زور دیا۔ اس حوالے سے روسو کا کہنا ہے کہ:

> "The Man has been born free but every where is in chain."

> " انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔ لہذا روسو نے انسان کی آزادی اور ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے جہاں انسان اصولوں اور کائنات کے ضابطوں کے لیے نہیں بلکہ کائنات خود انسان کے لیے ہے۔ وہ شہنشاہ ہے جو اصولوں کو روندتا ضابطوں کو ٹھکراتا نئے شعور کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے "۔ (۶)

رومانوی تحریک نے ادیب کو بھی متاثر کیا۔ انگریزی شعرا کی بات کی جائے تو ان میں ورڈزورتھ کو فطرت کے رنگارنگ مناظر سے بہت محبت تھی اور اس کی سوچ کے مطابق فطرت اور انسان کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ ورڈزورتھ کی فطرت پرستی سے کالرج بھی متاثر تھا۔ اس کی ابتدائی شاعری میں بھی مناظرِ

فطرت کے ساتھ دلچسپی کا اظہار ملتا ہے۔ اس نے غیر معمولی فکر و تخیل سے اپنی شاعری میں نئی روح پیدا کی۔ ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں:

"کالرج تخیل کو زندہ طاقت تصور کرتا ہے اور اسے انسانی دانش کا محرک قرار دیتا ہے"۔(۷)

اختر شیرانی کا نام اردو کے رومانوی شعرا میں سرفہرست ہے۔ ان کی شاعری میں رومانویت کا رجحان نمایاں ہے۔ زندگی کی ٹھوس حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے تخیل کی دنیا میں رہ کر ایک نیا جہان تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا محور عورت ہے۔ روایتی شاعری کے تصورِ عورت سے الگ ان کا تصورِ عورت ہے۔ وہ اشاروں میں بات کرنے کے بجائے وضاحت سے والہانہ طور پر اپنی محبوبہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اختر کی شاعری میں سلمیٰ، ریحانہ اور عذرا آئیڈیل کردار ہیں۔ اقبال کی شاعری میں رومانوی عناصر نمایاں ہیں۔ ان کے ہاں عقل سے زیادہ اہمیت جذبات اور وجدان کی ہے۔ لیکن اقبال کی امت مسلمہ کی مجموعی اصلاح اور مقصدیت انہیں رومانوی شعرا سے جدا کرتی ہے۔ مگر ان کی شاعری میں بھی رومانویت کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کا شمار بھی رومانوی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں ماضی پرستی، مناظرِ فطرت اور وطن پرستی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں شام کی رنگینی اور تاروں بھری رات وغیرہ فطرت پرستی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔ احسان دانش کے ہاں مناظرِ فطرت اور ماضی پرستی کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا شمار بھی رومانوی شعرا میں ہوتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری میں بھی رومانوی تحریک کے اثرات موجود ہیں۔ رومانوی تحریک کے زیرِ اثر ان کے ہاں اس طرح کے اشعار نظر آتے ہیں۔

آرہی ہے باغ میں مالن وہ اٹھلاتی ہوئی
مسکرانے میں لبوں سے پھول برساتی ہوئی
باربار آنکھیں اٹھاتی سانس لیتی تیز تیز
رس جوانی کا گھنی پلکوں سے ٹپکاتی ہوئی

(جوش ملی آبادی)

علی یاسر کی شاعری کلاسیکی اور جدت آمیز لہجے کا امتزاج ہے۔ انسان کے اندر محبت کا جذبہ فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا اسلوب نہایت شیریں اور رومانوی رنگ میں ڈھلا ہوا ہے۔ ان کے ہاں عشقِ مجازی و حقیقی سے بھرپور رومانوی لہجہ ملتا ہے۔ محبت کے مختلف روپ ہوں یا غم کے ترانے، ہجر کا دکھ ہو یا وصال کے لمحے علی یاسر نے ایک خاص رومانوی لہجے اور محبت بھری زبان میں ان کیفیات کو غزل میں برتا ہے۔ رومان اُن کی شاعری کی فضا کی عکاسی کرتا ہے۔ عشق کی کیفیات اور محبت کے لمحات ان کی شاعری میں بھرپور تاثر قائم کرتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی کرچیوں کو جمع کر کے محبت اور عشق کی بکھری آرزو کو جوڑنے اور پرونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یادوں اور لمحوں سے وابستگی ان کے خیالات کی پیوستگی اور تخیل آمیزی کو نمایاں کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں محبت کی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔ محبوب سے محبت کے اظہار پر فخر کرتے ہوئے اس کے قد کو سرو کے درخت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ پہلے سے اونچا ہو گیا سرو کا سر غرور سے
سرو کے ساتھ جب ترے قد کی مثال دی گئی (۸)

؎ دونوں کے ساتھ یہ ہوا، عمرِ محال دی گئی
عشق کو سادگی ملی، حسن کو چال دی گئی (۹)

مندرجہ بالا اشعار میں علی یاسر نے خوبصورت رومانوی لہجے کا اظہار کیا ہے۔ محبوب کی قامت کی دلکش تشبیہ دی گئی ہے جو ان کے جمالیاتی ذوق اور رومانوی کیفیات کا تخلیقی اظہار ہے۔ دوسرے شعر میں عشق و حسن کے خصائص کو شوخی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ عشق کی سادگی اور حسن کی اداؤں اور چالوں کو آشکار کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عشقیہ حوالے سے علی یاسر کی غزل میں بہت سے خیالات ملتے ہیں۔ اُن کے ہاں عشق و حسن کی کشمکش، محبت اور ہجر و وصال کے لمحات کا تخلیقی اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے کچھ مزید عشقیہ اور رومانوی اشعار ملاحظہ کریں:

؎ زمرۂ حرف میں توصیف نہیں ہو سکتی
یار ہم سے تری تعریف نہیں ہو سکتی (۱۰)

؎ کچھ لٹیرے نکال کر لے جائیں
کیسے دل کو سنبھال کر لے جائیں (۱۱)

علی یاسر کی غزلیات قاری کو عشق کی ذاتی اور جسمانی تسکین سے ہمکنار کرتی ہیں۔ علی یاسر اپنے محبوب کی بے وفائی کا اظہار کرتے ہوئے خود کو راستے کی خاک کہ کر محبوب سے گلہ کرتے ہیں کہ تو نے گزرتے وقت اِک نظر دیکھا بھی نہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

تو نے دیکھا ہی نہیں آنکھ اُٹھا کر اس کو
تیرے رستے میں کوئی خاک نشیں پڑتا ہے [۱۲]

علی یاسر کی شاعری میں عشق اور محبت میں مستقل مزاجی کا رویہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ عشق کی رمز کو سمجھتے ہیں اور اصرار یا بیقراری کا اظہار کرنے کے بجائے صبر کا دامن تھامے نظر آتے ہیں۔ شاعر کو دشت کی سیاہی میں صبر کا دامن تھامنے کا ہنر نظر آتا ہے۔ علی یاسر نے ہجر و وصال کے لمحات کو آزمائش سمجھ کر جیا ہے۔ ان کی شاعری عشق کا کوہِ گراں اٹھانے میں کامیاب رہی ہے۔ وہ عشق کے راستے میں گھبرائے نہیں بلکہ آرزوؤں کی آزمائش میں صبر کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں محبوب کی بے نیازی اور نظر انداز کرنے کے رویے کو عشق کے مدِ مقابل پیش کیا گیا ہے۔ علی یاسر نے محبت اور عشق کے جذبات کو فنکارانہ سطح پر پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری محبت کی متنوع کیفیات کو جمالیاتی سطح پر پیش کرتی ہے۔

تنگیٔ وقت میں جاگیر بنائی ہوئی ہے
ہم نے دل میں تری تصویر بنائی ہوئی ہے [۱۳]

علی یاسر کی شاعری میں محبوب کی یادیں مختلف رنگوں میں موجود ہیں۔ ان کے پاس محبوب کی یادوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ وہ محبوب کے چہرے، یادوں اور خوبصورتی کو اپنی جاگیر بنا کر دل کے بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی قسم کے بدلے کے طلبگار نہیں ہیں:

خال و خط میں نے بہر طور بنائے یاسر
کبھی آیا نہ وہ تصویر مری دیکھنے کو [۱۴]

شاعر کے دل میں جہاں محبوب کی یادیں بسی ہوئی ہیں، وہیں وہ اس بات کا تمنائی بھی ہے کہ محبوب خود آکر اس کا مشاہدہ کرے۔ جہاں عشق و محبت ہو وہاں ہجر جیسے موضوعات بھی لازمی ہوتے ہیں۔ علی یاسر نے بھی اپنی شاعری میں عشق اور محبت کی راہ میں آنے والے غموں کو اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ شاعر چاہتا ہے

کہ اس کا محبوب اس کے جذبات کو جان سکے اور اس کے چہرے سے اپنے لیے محبت کی کیفیات کو تلاش کر سکے۔

ے زیادہ عمر تری چاہ میں گزار چکے
جو رہ گئی ہے تری یاد میں بِتانی ہے [۱۵]

علی یاسر کے ہاں رومانویت کا عمومی رویہ زیادہ ملتا ہے۔ وہ عشق اور محبت کی کیفیت کے ساتھ ساتھ ماضی کی یادوں کو تخیل کے اظہار کے ساتھ غزل میں برتتے ہیں۔ وہ عشق کے راستے میں آنے والی تکلیفوں اور آزمائشوں سے واقف ہیں۔ وہ عشق کی تکلیف کو لذتِ عشق سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں عشق کی انتہا میں عاشق کو اپنے محبوب کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ علی یاسر کے کلام میں عشق کی کیفیات اور محبت کے تجربات ان کے تخیل اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ جذبے کے شعور کو بھی واضح کرتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق کے اثرات، بے سکونی اور جنون کی کیفیات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ علی یاسر مضبوط جذبے کا شاعر ہے۔

ے کتنے انبار کے انبار اٹھائے ہوئے ہیں
ہم ترے عشق میں آزار اٹھائے ہوئے ہیں [۱۶]

ے نیند بھی نہیں آتی، چین بھی نہیں آتا
عشق ایسا ہوتا ہے اور کیا بتائیں ہم [۱۷]

اُن کا کلام حسن و عشق کے رنگوں کے مختلف روپ دکھاتا ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ علی یاسر کا ذوقِ جمال ان کے خیالات کا آئینہ دار ہے۔ ان کی غزل سے اشعار ملاحظہ ہوں:

ے نامرادی شکست، حسرت ہے
عشق ہے یا کوئی مصیبت ہے [۱۸]

ے چھانتا ہوں میں خاکِ دشتِ حیات
قیس کو میرے ساتھ نسبت ہے [۱۹]

علی یاسر کی شاعری عشقیہ موضوع کو نمایاں طور پر بیان کرتی ہے۔ انھیں عشق کی راہ میں خاک چھاننے کا ہنر آتا ہے۔ وہ اپنے صبر، جذبات اور آزمائشوں کے ساتھ خود کو قیس سے نسبت دیتے نظر آتے ہیں ۔اس طرح وہ اپنے آپ کو عاشقوں کی پہلی صف میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے ہاں عشق کی آزمائشیں قنوطی رنگ میں بھی سامنے آتی ہیں۔ وہ ان نامرادیوں اور حسرتوں سے بیزار ہو جاتے

ہیں۔ وہ عشق کے ہجر و وصال اور آرزوؤں کے سفر میں اپنی مختلف کیفیتوں کو رومانوی لہجے میں تخلیقی اظہار کا حصّہ بناتے ہیں۔

؎ عشق میں ایسے غرق تھے، غافلِ غرب و شرق تھے
خود سے ہمیں خفا کیا تم نے ہمیں بُھلا دِیا[۲۰]

؎ دل کے احوال کو دل ہی میں رکھا کرتے ہیں
اپنی پیشانی پہ مرقوم نہیں ہوتے ہم[۲۱]

علی یاسر عشق کی سختیوں کو ہنس کر سہنے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک محبوب کے تغافل اور اس کی رضامندی کے لیے آزمائشوں سے گزرنے کا دیرپا صبر اور حوصلہ درکار ہوتا ہے جو شاعر کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر جذبات کے اظہار کا قائل نہیں، وہ اپنے محبوب کو خبر کیے بغیر ہی اس کے عشق میں جلنا چاہتا ہے۔ ان کا رویہ خاموش محبت والا ہے۔ وہ خاموشی سے دل میں اُتر جانے کے قائل ہیں۔ ان کی غزل گوئی میں رومانویت اور عشق کا جذبہ بہت نمایاں اور تنوع کا حامل ہے۔

زندگی کی بے ثباتی

علی یاسر کی غزل گوئی موضوعاتی اعتبار سے تنوع کی حامل ہے۔ ان کا سماجی و عصری شعور ان کے تخلیقی شعور کا عکاس ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر فنکارانہ روشنی ڈالی ہے۔ جہاں وہ زندگی، زندگی کے رنگوں اور جذبوں کی بات کرتے ہیں وہیں ان کے کلام میں فنا، زندگی کے عارضی پن اور موت کے تصور کا عکس بھی مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ بطور مسلمان اور تخلیق کار وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ زندگی عارضی ہے۔ انسان توانا اور طاقت ور ہونے کے باوجود کمزور ہے۔ اس کا اپنی زندگی پر اختیار نہیں، موت کا وقت مقرر ہے۔ علی یاسر کے کلام میں زندگی کی بے ثباتی کا رویہ مختلف زاویوں اور کیفیتوں کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی بے ثباتی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ تجھے تو علم بھی تھا میری ناتوانی کا
پکارتا رہا میں اور تُو نہیں آیا[۲۲]

؎ اشکوں کی نہر سینت کر، بخت ہوا تھا دربدر
پھر یہ ہوا وہ نہر بھی مجھ کو سنبھال دی گئی[۲۳]

؎ زندگی نقشۂ نشیب و فراز

آہ میں قہقہہ بدلتا ہے (۲۴)

علی یاسر کو بخوبی اس بات کا اندازہ ہے کہ انسان کو جتنی بھی طاقت، صلاحیت اور امید حاصل ہو زندگی کا نشیب لازم ہے۔ علی یاسر زندگی کا مشاہدہ ایک فنکار کے طور پر کرنے کے قائل ہیں، وہ زندگی کے ذائقوں اور رنگوں سے لطف انداز ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ہم لوگ زندگی کی رنگینوں اور خوبصورتیوں میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ اس زندگی کا خاتمہ بھی ہونا ہے اسے بھول بیٹھتے ہیں۔ جیسے ہی موت اپنے رنگ بکھیرنے لگتی ہے زندگی کے رنگوں کو موت کے رنگ اپنی آغوش میں لینے لگتے ہیں اور زندگی کی حقیقت یہی ہے۔ اس کا ایک لمحے کا بھروسا نہیں۔ انسان جتنا بھی زندگی پر اعتبار قائم کر لے کوئی بھی طاقت ور چیز اُسے موت سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ زندگی فانی ہے یہ دنیا عارضی ہے۔ علی یاسر کے بے ثباتی کے موضوع پر اشعار ملاحظہ کریں:

ہم زمیں زاد ذرا شاد ہوئے تو یاسر
رنگ افسوس کا افلاک پہن کر آئے (۲۵)

میں پستیوں کا نوالہ بنا ہی چاہتا ہوں
کہ ہاتھ اس نے بھی کوہِ ندا پہ چھوڑ دیا (۲۶)

علی یاسر کو اچھی طرح ادراک ہے کہ انسان جتنا مرضی اونچائی پر پہنچ جائے بالآخر زیرِ خاک پہنچتا ہے۔ وہ خاک میں ملنے کی حقیقت سے آشنا بھی ہیں اور قائل بھی۔ انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز اور مسرت و غم کی کیفیتوں کے مختلف رنگ دیکھے ہیں۔ وہ زندگی کی تگ و دو اور جہدِ مسلسل کے بعد لمبی نیند کے قائل بھی ہیں یعنی انھیں اس حقیقت کا ادراک بھی ہے کہ موت کی نیند ایسی ہے جس میں کوئی مخل نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا عارضی ٹھکانا ہے۔ اصل منزل سوئے افلاک ہے اور وہ اسی منزل کی جستجو اور تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زندگی میں محبوب مجازی اور محبوب حقیقی کی قربت اور خیالات کی جستجو کرتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ میری زندگی محبت اور عشق میں رقص بسمل کی طرح گزرے کیونکہ جب موت نے آنا ہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں موت پر کسی کا اختیار نہیں چاہے کوئی بادشاہ ہو یا فقیر امیر ہو یا غریب اس نے موت کا مزا ضرور چکھنا ہے۔ علی یاسر کے ہاں زندگی کی بے ثباتی کا رویہ بہت واضح ہے ساتھ ہی ان کے اشعار سے ان کی اداسی کی کیفیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بڑی طویل مسافت کے بعد سویا ہوں

یہ دشت اچھا ہے کوئی جگانے والا نہیں (۲۷)

علی یاسر کی شاعری میں جہاں زندگی کا موضوع بہت نمایاں ہے، وہیں زندگی کی بے ثباتی اور موت کے بعد کی زندگی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔ انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ زندگی کے بعد موت کا سامنا کرنا ہے۔

میں یہ سنتا ہوں وہاں میرا امکاں تھا، پہلے
چل پڑا ہوں سوئے افلاک وہی دیکھنے کو (۲۸)

علی یاسر کے ہاں دوسرے جہاں کا تصور ان کے ایمان کی بدولت ہے۔ وہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے شاعرانہ انداز میں موت کے منظر کو پیش کیا ہے۔ خاک سے افلاک تک کے سفر کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ شاعر کا زندگی اور موت کے بارے میں تصور بالکل واضح اور عقیدت سے جڑا ہوا ہے:

سانس میں تیرا اسم ہو، رقص میں میرا جسم ہو
زندہ رہا تو ٹھیک ہے، موت پہ اختیار کیا؟ (۲۹)

علی یاسر زندگی کی رنگینی اور فطرت کی خوبصورتی کے قائل تو ہیں مگر عارضی پن اور بے ثبات تغیر کے بھی قائل ہیں۔ علی یاسر کے ہاں زندگی اور موت کے تصور کے حوالے سے جرات آمیز تخلیقی اظہار ملتا ہے۔ وہ اس المیے کو بیان کرتے ہیں کہ ہم زندگی گزارتے ہوئے زندگی کے رنگوں اور آسائشات کی کیفیتوں میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ زندگی کے مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں کہ ہماری زندگی عارضی ہے۔ علی یاسر نے جرأت مندی سے ان حقیقتوں کو اپنی تخلیقات کا حصّہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی خوبصورتی سے الگ ہونا اتنا آسان نہیں تھا مگر انھوں نے جرأت سے دنیاداری اور دنیا سے ناتا توڑا اور خالق حقیقی سے جا ملے اور موت کو گلے لگایا۔ انھوں نے موت کے قریب آنے پر شور نہیں مچایا بلکہ حقیقت کو گلے لگایا کہ دنیا اور زندگی عارضی ہیں۔

دنیا کو چھوڑنا مجھے آسان تو نہ تھا
چپکے سے چھوڑ آیا تماشا نہیں کیا (۳۰)

علی یاسر سماجی رویے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ہم دنیاوی آسائشوں کی جمع آوری میں مگن اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے معاشرے اور معاشرتی رویوں کا

بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ ایک طرف سچائی، ایمانداری، خلوص، محنت اور وفاداری کا جذبہ ہے تو دوسری طرف جھوٹ، فریب، منافقت اور غربت جیسے رویے بھی موجود ہیں ہر چیز نے فنا ہونا ہے۔

زندہ رہتے ہیں مگر یہ سوچتے بالکل نہیں
ہم نے بھی جانا ہے آخر اس جہاں کو چھوڑ کر (۳۱)

علی یاسر کو اس بات کا اندازہ ہے کہ لمحۂ زیست بہت مختصر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نامی گرامی لوگ بھی دارِ فانی سے کوچ کر گئے تو انہیں بھی یہ دنیا چھوڑنی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ یہاں رہنے کے لیے نہیں آئے بلکہ وہ تو اپنے اشعار میں آرزو کرتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی لحد کو برابر کر دیا جائے تاکہ ان کی لحد کے بارے میں کوئی جان ہی نہ پائے۔ وہ گم نام رہنا پسند کرتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ ان کا نام بڑا نہیں نہ وہ کوئی بڑا کارنامہ ہائے سرانجام دے پائے ہیں تو پہچان بنانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی اور اب تک کی زندگی کی جدوجہد سے زیادہ مطمئن نہیں وہ زیادہ کے خواہش مند نہ تھے۔ عاجزی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی قبر کو گم نام رہنے دیا جائے وہ اس قابل نہیں کہ ان کو یاد رکھا جائے۔ علی یاسر جانتے ہیں بڑے بڑے بادشاہ بھی فنا ہونے سے نہیں بچ پائے۔ وہ تلخی اور عارضی پن کے ساتھ کہتے ہیں کہ مٹنے والے شہر میں میرا بھی آشیانہ تھا۔

مجھ کو دفنا کے مری قبر برابر کر دو!
میں نے کب سلسلۂ نام و نشاں رکھا ہے (۳۲)

میرا بھی تھا اس میں آشیانہ
جو شہر بھسم کیا گیا ہے (۳۳)

علی یاسر کا فکری شعور ان کی فنی اور تخلیقی بالیدگی کا مظہر ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی بے ثباتی کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی اور موت دونوں پر یقین رکھتے ہیں، یہی ان کا ایمان ہے۔ ان کے نزدیک وہ ہر وقت موت کا خیال اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ وہ حق کے در پر کفن باندھے پیش ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی لمحے بارگاہ ایزدی سے موت کا پروانہ تھمایا جا سکتا ہے۔ علی یاسر کے ہاں فکری پختگی ان کے منفرد شاعر ہونے کی بھی آئینہ دار ہے۔ علی یاسر اس سچائی سے منہ نہیں موڑتے کہ موت کا وقت مقرر ہے لہٰذا وہ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ موت کے تصور کو بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ

زندگی میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں اور موت کا خیال بھی ذہن میں نہیں رکھتے۔ اس حوالے سے ان کی غزلیات سے اشعار ملاحظہ کیجیے:

؎ ہم کفن پوش چلے آئے تری محفل میں
جانتے ہیں کہ اشارا کیا جاسکتا ہے (۳۴)

؎ کچھ لوگ فنا ہیں زندگی پر
کچھ لوگ قضا کے منتظر ہیں (۳۵)

علی یاسر کے نزدیک لوگوں کا جب اچانک اس حقیقیت سے واسطہ پڑتا ہے تو یقین نہیں آتا مگر کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں ہے ہر چیز نے مٹنا ہے۔ شاعر کے نزدیک محبوب پر مرتے مرتے یعنی اس کی آرزو کرتے کرتے دنیا سے ہی رخصت ہو جانا بہتر ہے۔

علی یاسر موت کے رنگ کو شوخ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کچھ وقت نیک لوگوں کے ہمراہ بھی گزار لوں تاکہ آخرت میں نامہ اعمال میں کچھ تو لے کر جاسکوں۔ یہ ان کا شاعرانہ انداز ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی کی بے ثباتی اور عارضی پن کی مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں۔ کلاسیکی شاعری کا یہ رنگ نئ غزل کا اہم موضوع ہے کیوں کہ ان کیفیات سے ایک بڑا طبقہ متاثر ہے۔ علی یاسر ناامید شاعر نہیں ہیں۔ وہ زندگی کے ذائقے سے بھی آشنا ہیں اور موت کی حقیقت اور بے ثبات دنیا سے بھی آشنائی رکھتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کریں:

؎ مرنے کے بعد کچھ تو حساب و کتاب ہو
دو چار گام شیخ کے ہمراہ چل مروں (۳۶)

؎ کرتے کرتے یہ بھی آخر کر جانا ہے
تم پر مرتے مرتے ایک دن مر جانا ہے (۳۷)

علی یاسر کے ہاں زندگی کی بے ثباتی کا تصور واضح ہے۔ انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ زندگی کی خوبصورتی، رنگینی اور آرزوؤں کے باوجود سب فنا ہونا ہے۔ کوئی چیز دائمی نہیں ہے۔ علی یاسر انسان کی عارضی زندگی اور موت کی حقیقت کو شعری اظہار کا فنکارانہ سطح پر حصّہ بناتے ہیں۔ ان کے خیال میں دکھ درد زندگی میں کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ صرف موت ہی ان دکھوں کو کم کر سکتی ہے۔ انھیں اس زندگی سے زیادہ مرنے کے

بعد کی دنیا سے سروکار ہے۔ ان کا تصورِ فنا و بقا جمالیاتی سطح پر فنی بالیدگی کا مظہر ہے۔ انھیں اس بات پر یقین ہے کہ ہر چیز نے فنا ہونا ہے کسی شے کو دوام حاصل نہیں ہے۔

اخلاقی و سماجی رویے

علی یاسر کا شمار معاصر اردو شاعری کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی و جدید خیالات کی آمیزش موجود ہے۔ ان کا زندگی کے حوالے سے مشاہدہ اور تجربہ بھرپور ہے۔ وہ سماج سے کٹے ہوئے نہیں ہیں۔ اُن کا کلام اُن کے سماجی و عصری شعور کی بالیدگی پر روشنی ڈالتا ہے۔

علی یاسر سماج کی حقیقتوں، سماجی برائیوں اور سماج کے مکروہ چہرے کو تخلیقی اظہار کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔ معاشرتی بے حسی، سماجی بے انصافی، معاشی بے اطمینانی، غربت و معاشی استحصال کا رجحان عہدِ حاضر میں بڑھتا جارہا ہے۔ وہ لوگوں کی منافقت اور دیگر رویوں پر برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مشکل میں لوگ تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے میں انسان اپنی مدد آپ کے تحت زندگی بسر کرتا ہے جس سے زندگیاں بدمزہ ہو گئی ہیں اور انسان اکیلے پن کا شکار ہو گیا ہے۔ سماج کے ان مناظر کو علی یاسر نے خوب صورتی سے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ علی یاسر کے نزدیک ایسے لوگ بھی ہیں جو ضرورت پڑنے پر اجنبی بن جاتے ہیں۔

؎ خیال آیا کہ میں کس قدر اکیلا ہوں
کھڑا ہوں بھیڑ کے اندر مگر اکیلا ہوں (۳۸)

؎ یہ تم تو آئے نہیں ہو غریب خانے میں
ضرور کوئی ضرورت پہنچ گئی ہو گی (۳۹)

ان اشعار سے اداسی کی کیفیت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ لوگ ضرورت کے تحت قریب آتے ہیں۔ خلوص کے رشتے ختم ہو گئے ہیں بغیر کام اور ضرورت کے کوئی کسی کی دلجوئی نہیں کرتا، نہ قریب آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں ضرورتیں، ملاقاتوں کا سبب بنتی ہیں ورنہ خلوص کے ساتھ دوست وقت بانٹنے کو تیار نہیں ہوتے۔ علی یاسر منافقت اور غیبت کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ طنز کرتے ہیں کہ ایسے بدگمان لوگوں سے پناہ مانگنی چاہیے۔ جو غیبت کرتے ہیں اور کردار کشی کرتے ہیں۔ شاعر اعلیٰ ظرفی سے شرمندہ اور نادم ہونے والوں کو درگزر کرنے پر بھی تیار نظر آتے ہیں۔

؎ اُسی سے پوچھیے گا بد گمانیوں کا علاج
اِدھر کی بات کو جس نے اُدھر کیے رکھا [۴۰]

علی یاسر معاصر غزل گو شاعروں میں اپنے عصری اور سماجی شعور کی بدولت بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا تخلیقی اظہار جہاں رومانویت کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہیں حقیقت پسندانہ مسائل کو تخلیقی اظہار کا حصّہ بنایا ہے جس سے رشتوں کی بقا بھی خطرے میں نظر آتی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ تُو اگر اپنے رویے پہ ہوا ہے نادم
پھر ملاقات کا چارہ کیا جا سکتا ہے [۴۱]

؎ میرے پُرکھوں کی روایت ہے برا مت مانو
صاف گوئی میری عادت ہے برا مت مانو [۴۲]

شاعر اسی سماج کا حصہ ہے۔ وہ جہاں جھوٹ، منافقت ،غیبت اور ضرورت کے تحت تعلق پر طنز کرتا ہے۔وہیں نادم ہونے پر معافی کو بھی ترجیح دیتا ہے۔خود بھی اس سماج کا حصہ ہونے کے باوجود سچائی کا علم بلند کرتا ہے جھوٹ سے اجتناب برتا ہے۔وہ کردار کی اہمیت سے واقف ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سماج میں سچائی کے ساتھ چلنا اس کا ساتھ دینا، سچ کو نبھانا، سچ سننا آسان نہیں۔اگرچہ لوگ سچ سن کر برا مانتے ہیں مگر شاعر اپنی پرکھوں کی روایت اور سچائی کی روش پر چلنے کے لیے تیار ہے۔ وہ اس سماج میں سچ کو اپنانے کا عہد کرتا ہے۔علی یاسر کے سماج کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

؎ دکان کھولی ہے فنکار یار لوگوں نے
جو خود کو آتا نہیں وہ سکھا کے چلتے بنے [۴۳]

؎ جہاں سے کر دیا بیگانہ روزگار نے دل
کسی سے یہ تھکا ہارا ملے تو کیسے ملے [۴۴]

مندرجہ بالا اشعار میں علی یاسر نے لوگوں کی کم ظرفی اور دوغلے معیار کو بیان کیا ہے۔کم ظرف اہل ہنر اور اہل ذوق جھوٹی دسترس کے ذریعے ہنر سکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ چلن ہمارے سماج میں بہت عام ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ روزگار کی تلخ حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں جو صرف کسی ایک کا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی مسئلہ ہے۔ غمِ روزگار نے غمِ عشق سے دور کر دیا ہے۔ رزق کی جستجو اور روزگار، جذبات اور عشق کے جذبے کو پنپنے نہیں دیتا۔ علی یاسر کے نزدیک سماج یا معاشرہ ہم سے ہے اور ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں۔اس

کی خرابیاں وہی ہیں جو ہم میں ہیں۔ وہ سماج کی تلخ حقیقتوں کو فنکارانہ اور تخلیقی اظہار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اس سماج کی تلخ حقیقتوں کو فنکارانہ اور تخلیقی اظہار سے پیش کرتے ہیں۔ وہ ان سماجی رویوں کے اثرات خود پر منتقل ہوتے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ خود کو سماج سے کٹتے ہوئے اور بے یقینی کی کیفیات میں الجھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ بھی اپنی سننے کی بجائے سماج کی سنتے ہیں۔ وہ اپنی شہرت پر خوش ہونے کی بجائے پریشان ہیں کہ خود سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ علی یاسر کے ہاں سماج میں وعدہ خلافی کا رویہ بھی ملتا ہے۔ لوگ وعدہ کر لیتے ہیں مگر نبھا نہیں پاتے۔ یوں علی یاسر نے سماج میں اخلاقی گراوٹ، منافقت، جھوٹ، غیبت اور وعدہ خلافی جیسے رویوں کو تخلیقی سطح پر برتا ہے۔

خود سے کم کم ہوا جانے لگا رشتہ یاسر
لوگ کہتے ہیں کہ مشہور ہوا چاہتا ہوں (۴۵)

تجھے بھی وعدہ نبھانے کا ڈھب نہیں آیا
مجھے بھی اپنی ہر اک بات سے گزرنا پڑا (۴۶)

علی یاسر کی شاعری میں ان کا عصری و سماجی شعور ان کو معاصر شاعروں میں نمایاں کرتا ہے۔ وہ سماج پر بھرپور نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک لوگوں کے اندر حسد، بے حسی، غیر اخلاقی برائی بھی موجود ہے۔ لوگوں میں اس برائی کو کم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک بعض اعلیٰ ظرف، تخلیقکار اور فنکار بھی اس برائی سے نہیں بچ پاتے۔ لوگ حسد کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس طرح سماجی برائیوں میں دوہرا معیار بھی شامل ہے۔ لوگ منہ پر تعریف کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک ایسی تعریف سے منہ پر گالیاں سننا زیادہ منافع بخش ہے۔

جب دیکھو حسد ہی کر رہے ہیں
کچھ لوگ تو حد ہی کر رہے ہیں (۴۷)

سامنے داد ہو اور بعد میں غیبت بن جائے
ایسی تعریف سے بدخواہ کی گالی اچھی (۴۸)

علی یاسر کی شاعری میں سماجی رویے اور غیر اخلاقی برائیوں کا ذکر شاعرانہ اور فنکارانہ سطح پر ہوا ہے۔ ان کا سماجی و عصری شعور پختگی اور ہنر مندی کا عکاس ہے۔ علی یاسر سے اپنے سماج کی بے رُخی اور بے مروتی برداشت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک جب انسان پر بُرا وقت آتا ہے تو اپنے پرائے سب منہ موڑ لیتے ہیں۔

لوگوں کے معیارات بدلتے رہتے ہیں ہر کوئی اپنے مفاد اور آسانی کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ شاعر کا بھی یہی حال ہے۔ اسے اپنے شہر میں کوئی شناسا چہرہ نہیں ملتا۔ ہر کوئی مطلب کے لیے ملتا ہے۔ ہمارے سماج کی تلخ حقیقت ہے کہ جس کے پاس دولت کی فراوانی، عزت و مرتبہ ہے۔ ان کی خطر دنیا مسلسل رنگ بدلتی ہے۔ دنیا کے لوگوں کا رویہ منافقانہ ہے۔ شاعر اس چیز سے بیزار بھی ہے اور خبر دار بھی۔ وہ دنیا داری سیکھ گیا ہے اور اس دنیا کی چالاکی اور منافقت سے شناسا ہو گیا ہے اور اور دوبارہ اس میں پھنسنے والا نہیں ہے۔

؎ اپنے ہی شہر میں کوئی پہچانتا نہیں
اے یار کیا بتائیں ہوئے دربدر کہاں (۴۹)

؎ ہر گام پہ بہروپ بدلتی ہوئی دنیا!
آجاؤں گا دھوکے میں دوبارہ بھی؟ نہیں میں (۵۰)

شاعر خود کو قید میں نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ خود کو سماج کی پابندیوں کا شکار کرنے پر بھی مطمئن نہیں ہے۔ وہ آزادی اور جرأتِ اظہار کے ساتھ جینا پسند کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ معاشرے میں خود کو مقید تصور نہ کرے اور اس کو رہنے اور بولنے کی آزادی میسر ہو۔ دوسری طرف علی یاسر اس بات سے پریشان نظر آتے ہیں کہ ہم پابندیوں اور سختیوں پر مطمئن ہیں۔ ہمارے سماج کے لوگ مصلحت، قوت اور طاقتور کے آگے بے زباں ہو جاتے ہیں ان میں جرأتِ اظہار کی کمی آجاتی ہے۔ البتہ شاعر سماج کے برعکس جرأت اظہار بھی رکھتا ہے اور جرأتِ گفتار بھی۔ وہ اس سماج میں رہتے ہوئے غلط اور ناانصافی کے خلاف بولنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں سماج کی سختیوں اور ناانصافیوں کے خلاف بولنے اور لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

؎ کیوں راس نہیں فضائے زنداں؟
کیونکر زنجیر مطمئن ہے (۵۱)

؎ آدمی زاد ہوں مجھ کو نہ فرشتہ سمجھو!
لب کُشا ہونے کی ہمت بھی تو پڑ سکتی ہے (۵۲)

علی یاسر کا سماجی اور عصری شعور بہت توانا اور تخلیقیت سے بھرپور ہے۔ وہ سماج کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ علی یاسر کے نزدیک ہمارا سماج بدگمانیوں، منافقت اور بے یقینی کے گرداب میں پھنسا ہے۔ سکون اور اطمینان کی بجائے لوگ بے یقینی اور بے سکونی کا شکار ہیں۔ اس کے علاوہ بھرم، لحاظ اور تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک دوسرے سے منافقانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اپنے

اور پرائے کا فرق بھول بیٹھے ہیں، پرانی دوستی کا بھی پاس نہیں رکھتے اور منافقت کا شکار ہیں۔ منہ پر تعریف و توصیف سے کام لیتے ہیں اور پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہیں۔ شاعر علی یاسر اس سماجی رویے سے بیزار نظر آتے ہیں۔ ان کو منہ پر برا بھلا گوارا ہے مگر وہ جھوٹی تعریف نہیں چاہتے۔ وہ سچائی اور حق گوئی کے قائل ہیں اور کھوکھلے رویے کے خلاف ہیں۔ علی یاسر کا سماج کا مشاہدہ ان کے عصری شعور پر دال ہے۔ وہ سماج کے تنوع اور تضادات کو فنکارانہ بصیرت اور تخلیقی جرأت کے ساتھ اپنی شاعری کا حصّہ بناتے ہیں:

؎ گماں کے سائے میں گرداں ہماری گلیوں میں
سکوں سے سوئے ہوؤں کو جگا کر چلتے بنے [۵۳]

؎ خیال کچھ تو کر اے یار! بات کرتے ہوئے
ہمارے ساتھ تری دوستی پرانی ہے [۵۴]

؎ سامنے داد ہو اور بعد میں غیبت بن جائے
ایسی تعریف سے بدخواہ کی گالی اچھی [۵۵]

علی یاسر نے سماج میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں سے رونما ہونے والے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی، ان کی شاعری عصری تقاضوں اور روایت سے بیک وقت اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ انہوں نے فرسودہ اور غیر منطقی باتوں کو کلام کا حصّہ نہیں بنایا۔

غربت و افلاس

علی یاسر کا عصری شعور ان کی فکر کی بالیدگی کا مظہر ہے۔ علی یاسر کے ہاں سماجی حقیقتوں اور تلخیوں کی عکاسی فنکارانہ سطح پر ملتی ہے وہ معاشرے کی حقیقت اور بھوک کے مضمرات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے کلام میں غربت و افلاس کی تلخ سچائیوں اور اس کے اثرات کو تخلیقی سطح پر پیش کیا گیا ہے کہ کیسے انسانیت کا فقدان اور بے حس معاشرہ تخلیق پا رہا ہے۔ انہوں نے غریب اور متوسط طبقے کو قریب سے دیکھا ہے۔ وہ رزق کی تلاش اور جستجو کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھوک ایمان کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ شاعر رزق کا متلاشی ہے۔

؎ یہ فردِ جرم دوبارہ نہ لگ جائے
مجھے گندم کے دانے کا جنون ہے [۵۶]

شاعر نے غریب لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے جہد کا اعتبار قائم کیا ہے۔ شاعر ناساز حالات میں بھی ناموری اور زندگی کو جلا بخشنے پر یقین رکھتا ہے۔ علی یاسر حساس شاعر ہیں اور مفلسی ہمارے سماج کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ مفلسی ہمارے ایمان تک کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ عزت و تکریم کا پاس رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ تہذیب کے آداب کو بھی بھلا دیتی ہے۔ حتٰی کہ مفلسی اپنے سماج سے بغاوت پر بھی اُکساتی ہے۔ علی یاسر کے ہاں بھی اس سماجی حقیقت کا بیان تخلیقی سطح پر ملتا ہے۔

؎ دیکھو ہمیں بے ضمیر لوگو

ہم بھوک میں ہی پلے ہوئے ہیں (۵۷)

علی یاسر اپنے اشعار میں سماج پر طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ وہ امیر زادوں اور بے ضمیر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ دیکھو ہم نے غربت و افلاس کے باوجود زندگی گزاری ہے۔ وہ زندگی کی دشواریوں اور مسائل کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کانٹوں کی سیج ہے۔ پھول چننے کے لیے کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے۔ وہ خود کو اس لحاظ سے بد نصیب تصور کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی غریبی اور مشکلات میں رہ کر گزاری ہے۔ وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی غموں سے بھری ہوئی ہے۔ مگر کچھ لوگ تمام عمر غربت و افلاس سے لڑتے رہتے ہیں۔ ان کا ماضی بھی غربت کا شکار رہتا ہے اور حال بھی افلاس کے زیرِ سایہ گزرتا ہے۔ شاعر کے نزدیک غربت و افلاس کا مستقل سامنا رہنا بد نصیبی بھی ہے اور آزمائش بھی۔

؎ میرے ہمراہ اک بد نصیبی رہی اور غریبی رہی

کل بھی تھی تلخ اور آج بھی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے (۵۸)

علی یاسر کے نزدیک غریب اور مزدور لوگوں کا المیہ یہ بھی ہے کہ ان کو ان کی محنت کے برابر اجرت نہیں ملتی۔ ان کی ضروریات کے مطابق انھیں رزق میسر نہیں آتا۔ اس المیے اور دکھ کو انھوں نے تخلیقی اظہار کا حصّہ بنایا ہے۔

؎ ہم وہ مزدور کہ جو بوجھ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

مر بھی جاتے ہیں کمائی نہیں ملتی ہے (۵۹)

علی یاسر عام انسان کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غریب آدمی کا درد محسوس ہوتا ہے۔ وہ غریب کے نوحہ خواں ہیں۔ ان کے ہاں رزق اور دولت کا لالچ نہیں۔ وہ رزق کی کشادگی اور اضافے کی دُعا کے ساتھ ساتھ رزق کو اللہ کی راہ میں بانٹنے کی تمنا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ حلال رزق کمانے کے ساتھ

ساتھ دوسروں میں بانٹنے اور سخاوت کے قائل ہیں۔ وہ صبر و شکر کے ساتھ خوش حال زندگی کے بھی تمنائی ہیں۔ انھیں اضافی رزق یا مال جمع کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ علی یاسر نے مال و متاع کا لالچ یا عہدے کا لالچ نہیں کیا۔ اُن کے کلام میں کسی قسم کے انعام کی خواہش یا لالچ نظر نہیں آتا۔ وہ خودداری اور انا کے قائل ہیں۔ وہ سفید پوشی اور کم تنخواہ اور آمدن پر خوشی اور سکون کے قائل ہیں۔ وہ اضافی رزق محتاجوں اور غریبوں میں بانٹنے کے قائل ہیں۔ وہ عہدے داروں اور افسروں کے تلوے چاٹنے اور شاہوں کے قصیدے پڑھنے کے خلاف ہیں۔

بانٹ دِیا کرتا ہوں زائد روزی یاسر
مری طلب ہے صرف گزر اوقات کا حصہ [۶۰]

علی یاسر نے انا اور عزتِ نفس کو ہر حال میں قائم رکھا ہے۔ اپنی ساری زندگی کسی بھی طاقتور کے سامنے سر جھکانے کو ترجیح بالکل نہیں دی۔ وہ معاشرے میں سر اُٹھا کر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ غربت کے باوجود وہ انا اور عزت کو ہر حال میں مقدم سمجھتے ہیں:

کٹیا میں مر گیا علی یاسر، کمال ہے
دربار کی طرف کبھی چہرہ نہیں کیا [۶۱]

علی یاسر کی شاعری میں مفلسی اور غربت کے مسائل پر تخلیقی انداز میں اظہار ملتا ہے۔ علی یاسر نے پیسے کے لالچ کو بھی تخلیقی اظہار کا حصّہ بنایا ہے۔ پیسے کی خاطر لوگ ایمان بیچنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مجرم اور قاتل دولت کے بدلے بے قصور اور معصوم قرار پاتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک غریب لوگ بھی پیسے کے پجاری ہیں۔ دولت ہر ایک کے عیب چھپا دیتی ہے۔ علی یاسر نے جہاں مفلسی اور غربت کے اثرات اور مسائل بتائے ہیں وہیں دولت کے اثرات بھی بتائے ہیں۔ دوسری طرف ان کے نزدیک بیروزگاری اور غربت اور معاش کے بوجھ تلے دبا ہوا دل کسی جذباتی وابستگی اور محبوب سے دل لگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسا بوجھل اور نا امیدی سے چُور دل عشق کا راستہ کیسے اختیار کرے۔ شاعر نے بیروزگاری اور مفلسی کے راستوں کو اپنی شاعری میں اس طرح بیان کیا ہے:

چند سِکے یہاں تاریخ بدل دیتے ہیں
قاتلوں کو یونہی معصوم کیا جائے گا [۶۲]

شاعر مفلسی و بیروزگاری کے باعث ہر چیز سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اُسے صرف معاش اور رزق کی فکر ہے علی یاسر نے سماج کی اس تلخ حقیقت کو کرب کے ساتھ بیان کیا ہے:

؎ جہاں سے کر دیا بیگانہ روز گار نے دل
کسی سے یہ تھکا ہارا ملے تو کیسے ملے (۶۳)

غربت و افلاس زدہ اس معاشرے میں رزق کے ساتھ ساتھ قیام کا مسئلہ بھی درپیش ہے بہت سے لوگ بے گھری کا شکار ہیں۔ ہمارے سماج میں بے گھری اور غربت بڑا مسئلہ ہے۔ لوگوں کو اپنے گھر میسر نہیں ہیں۔ کچھ لوگ درویش مزاج ہوتے ہیں جنھیں جہاں ٹھکانہ ملتا ہے وہیں رات بسر کر لیتے ہیں۔ یہ توکل کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ عاجزی کا مظاہرہ اس انداز میں کرتے ہیں:

؎ ہمیں قیام کے بارے میں فکر کیا یاسر!
جہاں نصیب میں ہو گا، وہیں پہ رہنا ہے (۶۴)

مجموعی طور پر ہم کہ سکتے ہیں کہ علی یاسر کی غزل گوئی میں مفلسی اور غربت و افلاس کا موضوع مختلف صورتوں میں سامنے آیا ہے۔ وہ ایک طرف بے گھری اور دوسری طرف غریبوں کے لالچ اور حرص کو بھی دکھاتے ہیں۔ عصری حیثیت ان کی شاعری کے افکار و خیالات میں ابھر کر سامنے آتی ہے جس میں ان کے افکار، سیاسی و معاشی صورتحال، رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک حساس اور مشاہدہ کرنے والے تخلیق کار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

ب۔ علی یاسر کی نظم کا تجزیاتی مطالعہ

شاعری جذبات کے اظہار کا سب سے اعلیٰ ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور مذہبی جذبات بھی انسان کو اظہار کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ علی یاسر نے نظموں میں حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مثنوی اور نظم کی دیگر ہیتوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کا جائزہ آئندہ سطور میں پیش ہے۔

i۔ حمد

حمد باری تعالیٰ مذہبی جذبات کے اظہار میں سرفہرست ہے جو بلحاظ موضوع نظم کے ایسے اشعار ہوتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی تعریف رقم کی جاتی ہے۔ مذہبی عقیدت اور نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو کسی بھی کام کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصل میں اللہ کی تعریف ہوتی ہے۔ علی یاسر نے بھی اپنے

شعری مجموعوں کی ابتدا حمد باری تعالیٰ سے کی ہے اور وہ اللہ کے بابرکت ذکر کے فضائل سے بخوبی واقف ہیں۔ "غزل بتائے گی" میں عقیدہ عنوان کے تحت لکھی نظم میں لکھتے ہیں:

جو ذکر خدا نہیں کرتا

اس کا دل بھی بسا نہیں کرتا(۶۵)

حمد نگاری کے مختلف انداز و اسالیب رائج ہیں جن میں موضوعات کی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ علی یاسر نے توصیفی انداز اپناتے ہوئے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس پاکیزہ ذات کی جانب رجوع کرتے ہوئے اپنی قلبی واردات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

گر ترے نام پہ موت آئے گی

مجھ کو مرنا ہے گوارا مولا(۶۶)

تیرا ہی ذکر صبح ہے تیرا ہی ذکر شام ہے

میری اساس ہے فنا اور تجھے دوام ہے(۶۷)

حمد کا یہ انداز جنون و مستی سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس میں تغزل کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ جس میں ایجاز و اختصار اور رمز و ایما کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ تخیل کی سنجیدگی ان کے اشعار میں جدت پیدا کرتی ہے۔ کہیں کہیں قافیہ ردیف کے بہاؤ میں ان کے ہاں الفاظ کے اصل معانی سے دوری بھی ہو جاتی ہے مثال کے طور پر ایک حمد میں شعر اس طرح ہے جس میں خدا کا نام بندے کی نجات کا باعث ہے اور اسی بندے کی طرف سے خدا کو سلامتی بھیجی گئی ہے اگرچہ سلام کا معنی "سلامتی والا" اور "نقائص سے پاک" بھی ہے مگر "تجھ کو سلام" سے مفہوم ایسا نہیں رہتا:

تجھ سے دعائے التفات، اسم ترا میری نجات

خالقِ دوجہاں ہے تو، تجھ کو مرا سلام ہے(۶۸)

اسی طرح ایک شعر میں "محروم" کے لفظ کو خدا کی شان بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ محروم عمومی طور پر ایسا احساس دیتا ہے جس سے خدا کی ذات پاک ہے:

تو ربِ جلیل ہے خدایا

محرومِ مثیل ہے خدایا[۶۹]

محروم کا لفظ کمی کے اظہار کے لیے عمومی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب "پاک" بھی ہے لیکن اردو کے مزاج میں اس لفظ کو پاکی کے معانی میں عام استعمال نہیں کیا جاتا۔ اسی مثنوی میں اشعار میں ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ کہ اول میں حضور ﷺ کا نور پیدا ہوا۔ نظم میں خدا کی تعریف بیان ہو رہی ہے کہ خدا نے کیا کیا پیدا کیا۔ اس مثنوی کی روانی پڑھتے ہوئے اچھی لگتی ہے اور ایک حدیث کا ٹکڑا بھی اس میں بہت خوبصورتی سے جوڑا گیا ہے:

؎ لولاک لما خلقت الافلاک
سب کچھ ہے بہ ذاتِ مصطفیٰ پاک [۷۰]

اسی طرح حمد میں بھی علائم و رموز اور غزل کی دوسری کیفیات غالب طور پر موجود ہیں۔ بحیثیت مجموعی طور پر حمد کے فنی لوازمات فن اور صنفی نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ جس سے والہانہ عشق اور عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔

ii۔ نعت

نعت موضوع کے اعتبار سے شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں مذہبی اور شعریت دونوں اصولوں کو برتنا ضروری ہوتا ہے۔ حضورؐ کی تعریف میں کہے گئے اشعار کا شمار نعت میں ہوتا ہے۔ نعتیہ کلام لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ نعتیہ کلام لکھنے میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے یہ ایک ایسی صنف ہے جو شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مختصر الفاظ کا استعمال کرے اور احترام کا خاص خیال رکھے۔ نعت شاعری کی ایسی صنف ہے جس کا تعلق رسول پاکؐ کی ذات سے اخلاص اور محبت سے ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کے مطابق:

> "یہ موضوع ایسا نہیں ہے جس پر ہر کس و ناقص تخیل اندازی اور خامہ فرسائی کر سکے اس راستے میں شاعر کو جگہ جگہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں ایک موضوع کا احترام شاعر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نپے تلے الفاظ کا استعمال کرے۔ حسنِ خطاب اور حسنِ بیان عقیدے کی تفصیلات اور باریکیوں کو ساتھ لے کر چلے۔"[۷۱]

علی یاسر نے اس صنف میں بھی بھرپور طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کچھ نعتیہ کلام ادبیات میں شائع ہو چکا ہے اور بہت سا نعتیہ کلام غیر مطبوعہ بھی ہے۔ ان کا نعتیہ کلام عمدہ الفاظ کے انتخاب اور عقیدتِ رسول اور محبتِ رسول پر مشتمل ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار عقیدت کی فراوانی اور خلوصِ نیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علی یاسر نے حضور پاکؐ کی ذات اور ان کی صفات کو اپنے نعتیہ کلام کا حصّہ بنایا ہے۔ علی یاسر کی نعتیہ شاعری میں سیرتِ رسول کے مختلف پہلو اور اخلاقِ حسنہ کے اوصاف کا اظہار ملتا ہے ان کے نعتیہ کلام سے اشعار ملاحظہ ہوں:

رنگوں کی مانگ بھرتی گئی ان کی خاکِ پا
پھولوں کو بانٹتی گئی مہکار، گفتگو [۷۲]

نورِ رحمت میں رہوں اور نمایاں ہو جاؤں
یا نبی ایک نظر میں بھی فروزاں ہو جاؤں [۷۳]

علی یاسر کے نعتیہ کلام میں بعض اوقات مدحت سے زیادہ گزارشات پر مبنی اشعار ملتے ہیں۔ نعت سے شعر ملاحظہ ہو:

دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو بس آپ سہارا ہیں
ہر چیز عطا کیجیے ہر بار کرم کیجیے [۷۴]

علی یاسر نے مدحتِ رسول میں تخلیقی اظہار کا شرف پایا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں کچھ نعتیں شامل ہیں جو ان کی عقیدت اور تخلیقی اظہار کی انفرادیت کو واضح کرتی ہیں۔ انھوں نے نعت کی صنف میں بھرپور دلچسپی لی اور بہت ساری نعتیں تخلیق کیں۔ ان کا نعتیہ کلام مجموعے کی صورت میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ لیکن ان کی نعتوں کا مسودہ تیار ہے اور ان کے نعتیہ کلام میں الفاظ کا انتخاب نہایت عمدہ اور اسلوب ندرت آمیز اور خیالات عقیدت سے بھرپور ہیں۔ علی یاسر کی نعت گوئی اپنی فکر کی تابندگی اور فنی بالیدگی اور الفاظ کے خوبصورت انتخاب کی بدولت تحسین و ستائش کے لائق ہے۔ ان کے غیر مطبوعہ نعتیہ کلام کا کچھ حصّہ ضمیمہ جات میں پیش کیا گیا ہے۔

iii۔ مرثیہ

علی یاسر نے نظموں میں کربلا اور اہلِ بیت کے موضوع کو خاص طور پر برتا ہے۔ حمد، نعت اور قصائد میں عام طور پر مدح بیان کی جاتی ہے لیکن مرثیہ موت یا شہادت کے بعد کا اظہار تاسف ہوتا ہے۔ جیسا کہ زیادہ تر قصائد کربلا اور شہدائے کربلا کے حوالے سے لکھے گئے اور اس کو وسعت دینے والے میر انیس اور مرزا دبیر ہیں۔ علی یاسر نے بھی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے عمدہ مرثیے تخلیق کیے۔ عام طور پر یہ صنف رونے رلانے سے تعلق رکھتی ہے جس میں شعری خصوصیات کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن علی یاسر کے ہاں عمدہ انداز میں صنف مرثیے کی پیروی کی گئی ہے۔ لیکن ان کا انداز بیان روایتی طرز سے مختلف ہے۔ مرثیے کے اجزا میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد وغیرہ کے مقابلے میں جدید اندازِ تغزل اپناتے ہوئے ان کے مرثیوں کا آغاز خود کے لیے دعائیہ کلمات سے ہوتا ہے۔

بے چین ہوں آلام سے آرام عطا کر

مجھ کو بھی کوئی منصب خُدام عطا کر

اے اسمِ الٰہی تُو مجھے نام عطا کر

اک مرثیہ صورتِ الہام عطا کر

تا عمر میں آسودہ احسان رہوں گا

شبیرؑ کا ثناخواں رہوں گا[۷۵]

چند اہم پابند نظموں میں "سرزمینِ کربلا"، "جشن ولادت امام علیؑ"، "نذرِ ابو طالب" اور سلام شامل ہیں۔ یہی موضوعات ان کے باقی شاعری میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔

"سرزمین کربلا" نام سے لکھا گیا پورا مرثیہ ایک حمدیہ انداز میں کی گئی دعا محسوس ہوتی ہے۔ جس کے آغاز میں وہ خدا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں بے چین ہوں مجھے آرام اس صورت میں دے کہ مجھے مرثیہ الہام ہو۔ اس میں وہ درِ مصطفی ﷺ کے ساتھ ساتھ آلِ محمد کا غلام ہونے کی دعا مانگتے ہیں۔ مرثیے کے آخر میں بڑی خوب صورتی سے کربلا کے لیے روانہ ہونے کا منظر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ حضرت ابو طالب کے لیے مدحیہ نظم لکھی ہے اور اس کی ردیف "اے پیارے مسلماں" رکھی ہے۔ اگرچہ یہ

مسلمانوں میں ایک اختلافی مسئلہ بھی ہے۔ تاہم انھوں نے اس نظم میں اپنے عقیدے کا اظہار واشگاف انداز میں کیا ہے اور اسی کی صحت پر زور بھی دیا ہے۔

ے "عمران کا ایمان تو کفار بھی جانیں، اپنے ہی نہ مانیں

حق یہ علی یاسر ہے کہیں قنبر و سلمان، اے پیارے مسلمان (۷۶)

ان کے تمام اشعار بلندی کردار اور خاندانِ رسول کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ جس کی تعریف و تحسین بار گاہ رسول خاتم الانبیاء کے حضور سنجیدگی سے پیش کی گئی ہے۔ انہوں نے خوب صورتی سے بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان سے سیرت و کردار کو قلم بند کیا ہے۔ ان کے کلام میں اظہار خیال کی تازگی اور قلبی واردات کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ لفظی اور معنوی خوبیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مرثیہ جہاں تاریخی حیثیت رکھتا ہے وہیں علی یاسر کے مرثیے جذبات نگاری اور رحم و کرم کی ایسی مثال پیش کرتے ہیں کہ انسانی ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

iv۔ سلام

مرثیہ، سلام اور نوحے نے ہر عہد میں قبولِ عام حاصل کیا۔ مرثیے اور سلام میں ایک حدِ فرق کے باعث مرثیے کی طرح سلام بھی ایک اہم ادبی صنف کی حیثیت سے اختیار کیا جانے لگا ہے۔ سلام میں مخاطب کے لیے خیر خواہی اور سلامتی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ بطور صنف اس میں عقیدت اور احترام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ افکار و خیالات سلام کو فکر اور فن کی بلندیوں تک پہنچاتے ہیں۔ اسلامی معاشروں میں اس کی خاص اہمیت یہ بھی ہے کہ اللہ پاک نے رسول اکرم ﷺ پر خاص درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں اردو شاعری میں حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بہت سے سلام لکھے گئے۔ علی یاسر کی سلام نگاری بھی اس تقلید کی غماز ہے۔ ان کے سلام بھی شہیدانِ کربلا کے لیے بطور عقیدت ملتے ہیں۔ جن کا نمایاں وصف حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی قربانیوں کے طفیل ان کی عظمت کو سلام پیش کرنا ہے۔ سلام کے حوالے سے شاعری میں اس نذرانہ، عقیدوت و احترام کے حوالے سے امداد امام اثر لکھتے ہیں:

"۔۔۔ عموماً سلام میں واقعہ کربلا و شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسینؑ و مصائب حضرت خاتون جنت ورحلت حضرت رسالت مآب ﷺ یوم القیام کے مضامین داخل رہتے ہیں۔۔۔ علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت مقصود ہے منظوم کیے جاتے ہیں۔"(۷۷)

اردو شاعری اس بیان کی عملی مثال پیش کرتی ہے۔ علی یاسر کی سلام نگاری بھی کربلا اور عشق رسول سے رچی بسی ہے۔ علی یاسر اس خراج تحسین، عظمت اور حوصلے کے بیان سے قوم کو ہمت اور حوصلے کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے ہاں شاعرانہ فن کاری، فنی حسن و جمال کے ساتھ ابھرتی ہے۔ راہ حق میں حضرت امام حسینؓ نے جو عظیم قربانیاں پیش کیں انہیں سراہتے ہوئے ان پر سلام بھیجتے ہیں۔ ان کے سلام سے چند اشعار دیکھیے:

ہمیشہ حق پہ رہے وہ بھی، ان کے آباء بھی
خلاف لشکرِ باطل ہوا قیام حسین
جو اس کی پیاس کے احساس میں رہے سیراب
ملے گا چشمۂ کوثر سے اس کو جامِ حسینؑ (۷۸)

ان اشعار میں باطل سے دور رہنے اور حق کا دامن پکڑنے کا درس بھی دیا گیا ہے۔ فنی سطح پر دیکھیں تو ہئیت کے اعتبار سے سلام غزل کی ہئیت رکھتا ہے۔ علی یاسر کے سلام مترنم اور عصری تقاضوں کے امین ہیں۔ خلوص کی چاشنی ان کے سلاموں کو پاکیزگی، نفاست اور لطافت عطا کرتی ہے۔ جو قلب و روح پر گہرے اور روشن طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ علی یاسر کی سلام نگاری جہاں واقعات کے اظہار میں خلوص و صداقت اور رمز و ایمائیت رکھتی ہے وہیں خارجی ماحول اور داخلی کیفیات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کے انداز بیان میں لہجے کی دل کشی سلیقے کے ساتھ زبان و بیان کا حسن نکھارتی ہے۔

v۔ دیگر نظمیں

علی یاسر نے نظم کی ہیئت کے متنوع تجربات کیے اور اپنے خیالات کی اکائی فکر و فن کی بلندیوں کے ساتھ پیش کی۔ ان کے ہاں شاعری کے مختلف تجربے صنفی اعتبار سے قائم ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں کا تنوع

غزل کے موضوعی تنوع سے جدا ہے۔ ان کی حمد، نعت، سلام، مرثیہ وغیرہ کا جائزہ پیش کیا جاچکا ہے یہاں ان کی دیگر مختلف نظموں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ نظم "نم دیدہ استغاثہ" مسدس حالی جیسے مضامین کو لیے ہوئے ہے لیکن یہ مختصر ہے۔ اور اسے پڑھتے ہوئے مولانا حالی کی " اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے" یاد آتی ہے۔

کٹی ہوئی ہے یہ ملت بڑی ادھوری ہے
حضور آپ کی رحمت بڑی ضروری ہے
سکت نہیں ہے تھکے ہارے ناخداؤں میں
حضور آپ وسیلہ ہیں بس دعاؤں میں
شہید و سیدِ کونین ہو کرم ہم پر
سنیں خدا کے لیے بین، ہو کرم ہم پر (۷۹)

علی یاسر نے ملی نغمے بھی لکھے۔ ملی نغموں میں روایتی طریقے سے وطن سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔ وہ جس سرزمین پر رہتے ہیں اس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر نوجوان اس ملک و قوم کی ترقی کے لیے بھرپور محنت کرے وہ نوجوانوں میں اپنی شاعری کی مدد سے وطن سے محبت کے جذبے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں اپنی سرزمین کی بدولت ہی وہ عظمت رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پہچان ان کے اپنے وطن سے ہی ہے ان کو اپنے وطن اور اس کی مٹی سے بہت محبت ہے۔ اس حوالے سے مثال ملاحظہ کریں:

اے مری سرزمیں اے مری سرزمیں
تیرے جیسا کوئی اس جہاں میں نہیں
میں اسی کے دم سے عظیم ہوں
یہ مقام ہے تو مقیم ہوں
مری فکر میرا شعور سب مری جستجو مرا دیس ہے (۸۰)

پابند نظموں میں عشق کے موضوعات پر زیادہ نظم نہیں ملتی بلکہ غزلوں کو وسیلہ اظہار بنایا گیا ہے۔ تاہم بعض نظمیں جو موجود ہیں ان نظموں میں ڈھیلا پن محسوس ہوتا ہے۔ ایک نظم "گڈمارننگ فلاورز" میں تقریباً چالیس سطور میں کسی کے پھول بھیجنے پر خوشی کا اظہار ہے۔ لیکن نظم میں مختصر بات کو بہت طول دیا گیا ہے۔ یعنی اس نظم کا خلاصہ ہے کہ سوشل میڈیا پر دیگر دوستوں کے ہوتے ہوئے وہ مجھے روز صبح کے وقت پھولوں کا میسیج کرتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ سلسلہ برقرار رہے"۔

وہ نہیں کرتی بھول، بھیجتی ہے

وہ مجھے روز پھول بھیجتی ہے (۸۱)

ایک اور نظم "حساب" ہے۔ اس میں شاعر کو کسی لڑکی نے کہا کہ مجھے ریاضی کے سوال سمجھنے ہیں مگر آپ کو تو شعر آتے ہیں۔ شاعر اس پر بہت کچھ کہنا چاہتا ہے پر سوچتا ہے کہ اس لڑکی کا حساب مجھ سے اچھا ہے تو اسے دینے کے لیے میرے پاس کیا ہے" یہ بھی انتالیس سطروں کی نظم ہے۔

جو سوچتا ہوں تو دل سے جواب آتا ہے

اسے تو مجھ سے زیادہ حساب آتا ہے (۸۲)

علی یاسر نے ماہیے لکھ کر بھی اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ ماہیے تین مصروعوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس صنف سخن کا پہلا اور آخری مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس بات کو ذہین میں رکھتے ہوئے انھوں نے ماہیے لکھے ہیں۔ یہ صنف پنجابی زبان میں مقبول تھی۔ شعرا نے متاثر ہو کر اس کو اردو میں بھی مستعمل کر لیا ہے۔ لہٰذا علی یاسر کے لکھے ہوئے ماہیے پنجابی کی سی سادگی رکھتے ہیں۔ مثلاً:

دل سچا ہوتا ہے

صبح جو دیکھوں تمھیں

دن اچھا ہوتا ہے (۸۳)

علی یاسر نے قلیل تعداد میں قطعات کی صنف پر قلم اٹھایا ہے۔ قطعات میں کم از کم دو اشعار ہوتے ہیں۔ علی یاسر کی قطعات اپنے لب و لہجے اور فکر کے اعتبار سے غزلیہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کے قطعات میں

جہدِ حیات اور عشق کی جستجو کے استعارے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کا چناؤ کلاسیکی اسلوب کے قریب ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ علی یاسر مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے غزلیہ رنگ سے باہر نہیں آپاتے۔ مثلاً:

؎اب رہ گیا ہے ایک سہارا نہ کھینچ لے

دشمن ہرے درخت کا سایا نہ کھینچ لے

تشہیرِ تشنگی سے گریزاں ہوں اس لیے

تشہیر تشنگی کہیں دریا نہ کھینچ لے (۸۴)

ہائیکو کو بنیادی طور اردو میں جاپانی درآمدی صنف کہا جاتا ہے۔ علی یاسر نے دو عدد ہائیکو لکھی ہیں۔ اس صنف میں علی یاسر نے منظر نگاری کو انتہائی نزاکت سے پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے روشنیوں رنگوں اور خوشبوؤں کی چھوٹی سی دنیا کو بہترین انداز میں پیش کیا۔ ہائیکو کے اشعار ملاحظہ ہوں:

؎اس نے مہندی سے بنایا اک پھول

آج چوما ہے ہوا نے وہ ہاتھ

چار سو پھیل گئی ہے خوشبو (۸۵)

لیکن انھوں نے اس صنف میں زیادہ طبع آزمائی نہیں کی۔ آزاد نظموں میں "روشن ستارہ"، "ہماری کہانی بہت مختلف ہے"، "قحط ہی قحط ہے"، "فرقت میرا مقدر" شامل ہیں۔ ان میں "فرقت میرا مقدر" ایک عورت پر گزرنے والی جذباتی تکلیف کا اظہار ہے کہ بچپن میں کھلونوں سے پھر گھر سے پھر شوہر اور بچوں اور آخر میں زندگی سے دوری۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ بچوں کی شادیاں ہوئی تو ان سے بھی بچھڑنا پڑا

ڈھلتی عمر

صحت نے ہمسفری سے جواب دے دیا

اور پھر زندگی سے بچھڑی" (۸۶)

اس نظم سے پروین شاکر کی کتاب انکار میں شامل نظم "میری قسمت جدائی ہے" یاد آتی ہے۔ تاہم علی یاسر نے اس نظم میں جن باتوں کی وجہ سے عورت کو مظلوم بتایا ہے۔ یہ صرف عورت کا مسئلہ نہیں، مردو

عورت دونوں ہی زندگی کے ہر درجے پر پچھلے دنوں کی خواہشات اور سہولتوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد روشن ستارہ غالباً کسی ادبی شخصیت کے لیے تعزیتی نظم ہے۔ نظم "قحط ہی قحط" میں علی یاسر اپنے ارد گرد سے مایوس دکھائی دیتے ہیں کہ یہاں کوئی یوسف ہوتا کوئی خواب ہی میں اشارہ ملتا مگر یہاں صرف غذا کا قحط نہیں بلکہ اخلاقیات اور انسانیت کا بھی قحط ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

"آج اطراف میں قحط ہی قحط ہے

فکر کا اور سچائی کا قحط ہے

علم اور دانائی کا قحط ہے"(۸۷)

نظموں کے جائزہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علی یاسر نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی اچھی تخلیقات کا اضافہ کیا ہے اور نہ صرف پابند نظم میں بلکہ آزاد نظم، ہائیکو، قطعات اور ماہیے میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی بعض نظموں میں وطن سے محبت کا جذبہ خوب جھلکتا ہے۔ انھوں نے ۶ ستمبر کے حوالے سے ملک کے دفاع کی خاطر جان قربان کرنے والے دلیر نوجوان جس کو نشانِ حیدر سے نوازا "میجر عزیز بھٹی شہید" کے نام سے ایک نظم لکھی۔ کشمیریوں کے عالمی دن کے موقع پر یکجہتی کشمیر کے لیے ایک گیت لکھا۔ قائد اعظم کے یومِ پیدائش کے موقع پر بھی ایک نظم "قائد کے لیے" لکھی۔ یہ تمام نظمیں غیر مطبوعہ ہیں جو کہ مقالے کے آخر میں بطور ضمائم لگائی گئی ہیں۔

ج۔ علی یاسر کی شاعری کا اُسلوبِ بیان

علی یاسر کی غزل اکیسویں صدی میں نمایاں ہونے والے شعرا کی نمائندگی کرتی ہے۔ اُن کی غزل تازگی اور کلاسیکی و جدید لہجے کے امتزاج کی حامل ہے۔ اُن کی غزل میں بوجھل پن نہیں بلکہ عمدہ الفاظ کا چناؤ اور اسلوب کا اچھوتا پن اور ندرت آمیز لہجہ اشعار کی روانی اور مٹھاس کو دوچند کرتا ہے۔ اُن کے لہجے میں نا تو پیچیدہ الفاظ کا استعمال ہے اور نا ہی مشکل اور بھاری تراکیب کا استعمال دکھائی دیتا ہے۔ وہ روزمرہ اور غزل کی زبان کے نرم و گداز الفاظ کو اپنی غزل کا حصّہ بناتے ہیں، جو ان کے اسلوب بیاں کو نکھارتے ہیں۔ ان کا اُسلوبِ بیاں ان کی انفرادیت اور جاذبیت کو سامنے لاتا ہے۔ اُن کی غزلیں اُن کے نرم و گداز اُسلوب بیاں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔

ہر گام پہ روپ بدلتی ہوئی دنیا!
آجاؤں گا دھوکے میں دوبارہ بھی؟ نہیں میں (۸۸)

زمرۂ حرف میں توصیف نہیں ہو سکتی
یار ہم سے تری تعریف نہیں ہو سکتی (۸۹)

علی یاسر کا کلام عصری شعور اور تازگی لیے ہوئے ہے۔ علی یاسر کی غزل میں تمثالی اسلوب بھی نمایاں ہے۔ اُن کے ہاں جمالیاتی تصویریں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ اُن کے اشعار میں رنگوں، جذبوں اور مناظر کی دلکش تصاویر دلکش تمثالوں کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں حسیاتی تمثالیں بھی قابل ذکر ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بصری تمثالوں کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے اشعار میں بعض تمثالیں بھرپور منظر کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ یہ تمثالیں جمالیاتی ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی بصری تمثال کی خوبصورت مثال ملاحظہ کریں۔

تیری نگاہ جب پڑی، سینے میں دل نہیں رہا
تیرا اشارہ جب ہوا، جان نکال دی گئی (۹۰)

علی یاسر کی غزلوں میں بصری کے ساتھ ساتھ سمعی تمثالیں بھی ملتی ہیں۔ اُن کی سمعی تمثالوں میں بھی فنکارانہ ہنروری نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار میں حسِ سماعت کے حوالے سے مختلف تجربات ملتے ہیں۔ ان کا ذوقِ جمال اور حسی ادراک سمعی تمثالوں کا دلکش نمونہ پیش کرتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

تجھے تو علم بھی تھا میری ناتوانی کا
پکارتا رہا میں اور تُو نہیں آیا (۹۱)

علی یاسر کے ہاں لمسی تمثالیں بھی ملتی ہیں۔ وہ حسن و جذبات اور فطرت کے خوبصورت جمالیاتی نظاروں کو اپنے تخلیقی شعور کے ساتھ اپنی غزلوں میں برتتے ہیں۔ ان کے اسلوب بیاں کو ان کا اسلوب چار چاند لگاتا ہے۔ اُن کے لہجے میں شرینی اور مٹھاس اُن کے دلکش اسلوب بیاں کی بدولت ہی ہے۔ اُن کے کلام میں کلاسیکی و جدید لہجے کا امتزاج نظر آتا ہے۔ تمثالی اسلوب نے ان کی غزل میں نیاپن اور نکھار پیدا کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور تجربات کو مشاہدے کی آنکھ سے تصور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زمین سوچتے ہیں آسمان دیکھتے ہیں
یقیں کی آنکھ سے حُسن گمان دیکھتے ہیں (۹۲)

بارش بھگو گئی تو سکھانے لگی ہوا
قسمت ہمارے حال سے بے خبر کہاں (۹۳)

علی یاسر نے غزل کو برتنے میں سلیقے سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں ان کا اسلوب بیاں داستانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ جو انھیں کلاسیکی مزاج کے قریب لے جاتا ہے۔ علی یاسر کلاسیکی رچاؤ اور لفظیات کے ساتھ تعلق جوڑے رکھتے ہیں۔ اُن کے الفاظ اُن کی غزل گوئی کی فکر کو بیان کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

علی یاسر کے ہاں کہیں کہیں علامتی اندازِ اظہار بھی ملتا ہے۔ مگر اس لہجے پر بھی داستانوی رنگ کی چھاپ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں استعماریت رنگ کے اشعار کو بھی علامتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

جنگ کرنی ہے اور مجھ سے ہی
میرا دشمن سپاہ مانگتا ہے (۹۴)

اس طرح علی یاسر کی غزل میں جو چیز انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے وہ ان کا منفرد اور نکھرا ہوا اسلوبِ بیاں ہے۔ ان کے ہاں داستانوی مرکبات وتراکیب کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ ان کے ہاں کلاسیکی و داستانوی علامت کا اسلوبیاتی انداز مختلف اور انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے کلام میں داستانوی رموز اور استعارے ان کی غزل کے مزاج کو کلاسیکی بنا دیتے ہیں۔ یہی خوبی علی یاسر کی غزل کے اسلوب کو الگ کرتی ہے۔ علی یاسر کی شاعری میں رمز وایمائیت کی خوبی ان کی شاعری کو فنی سطح پر پختگی عطا کرتی ہے۔

لہرا کر ڈستا ہے اُس کی زلف کا مارِ قاتل
بری نظر سے لوگ خزانہ دیکھ رہے ہوتے ہیں (۹۵)

علی یاسر کا اسلوب بیاں نرم گداز، تمثالی، داستانوی امتزاج کا حامل ہے۔ اور بیشتر اشعار میں علامتی رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان کا منفرد اسلوب انہیں معاصر شعرا میں اہم مقام عطا کرتا ہے۔

مکالماتی انداز

علی یاسر کی غزل میں مکالماتی اور استفہامیہ انداز ملتا ہے۔ وہ کہیں کہیں خود سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ سماج، محبوب اور مخاطب سے مکالے کا انداز اپناتے ہیں۔ ان کا یہ انداز بہت ہی دلکش اور فنکارانہ مزاج کا حامل ہے۔ ان کے مکالماتی انداز کے پیچھے اُن کا جمالیاتی رنگ اور تفکر آمیز لہجہ اور

سوچنے کی صلاحیت کا عمل بھی ہے۔ وہ کہیں خود کلامی کرتے ہیں تو کہیں خود سے سوال کرتے ہیں۔ کہیں وہ محبوب سے استفسار اور کلام کرتے نظر آتے ہیں۔

علی یاسر کی غزلیں اُن کے تفکر اور مکالماتی انداز بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ علی یاسر محبوب سے، خود سے اور سماج سے مکالمے کا انداز اپناتے ہیں۔ اُن مکالماتی انداز کی مثالیں ملاحظہ کریں۔

تم ہی بتلاؤ کہ یاسر میری تقصیر ہے کیا؟
میں نے تو ایک طرف ساری انا رکھ دی تھی (۹۶)

اب یہ گستاخ نگاہوں سے شکایت کیسی
پیرہن آپ ہی بیباک پہن کر آئے (۹۷)

علی یاسر کا مکالماتی انداز اس حوالے سے انفرادیت کا حامل ہے کہ وہ متنوع انداز میں اسے برتتے ہیں۔ ان کی غزل کا اچھوتا پن اور استفہامیہ استدلال ان کے تفکر کو مہمیز عطا کرتا ہے۔ ان کا مکالمہ روانی اور اپنائیت کے اعتبار سے اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ شاعر کے فنکارانہ ہنر کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کے معاصر شعرا میں بھی مکالماتی انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس لہجے کو غزل میں خوب پذیرائی ملی ہے۔ کچھ شعرا نے پورا پورا مجموعہ مکالماتی انداز میں لکھ ڈالا ہے۔

خود کو بھی گنوا دیا ہے، افسوس
کیوں تیری تلاش میں گیا میں (۹۸)

ہم کہ سکتے ہیں کہ علی یاسر نے جہاں مکالماتی انداز کو اپنایا ہے وہیں فنکارانہ سطح پر سلیقے سے اپنی انفرادیت بھی قائم کی ہے۔ ان کا مکالمہ تخلیقی انداز کا ہے۔ کہیں بھی بناوٹی لہجہ نہیں لگتا۔ وہ اپنے اسلوب اور لہجے میں مکالمہ کرتے ہیں اور یہی چیز ان کی شناخت قائم کرتی ہے۔ علی یاسر کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر مکالمہ خود کلامی کے انداز میں کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ دوستوں اور محبوب سے مکالمے کا انداز بھی اپناتے ہیں۔ اُن کا اچھوتا مکالمہ غزل کے تاثر کو اور بھی معنویت عطا کرتا ہے۔ عدیم ہاشمی، محسن نقوی، رابعہ بصری جیسے شعرا نے مکالمے کو باقاعدہ طور پر اپنایا۔ علی یاسر نے بھی غزل میں مختلف تجربات کیے ہیں۔ وہ بہت سادہ اور پر یقین لہجے میں محبوب سے مکالماتی انداز اپناتے ہیں۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ کریں:

کل تمہیں کوئی مصیبت بھی تو پڑ سکتی ہے
ہم فقیروں کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے (۹۹)

منظر نگاری

علی یاسر کی شاعری ذوقِ جمال اور فکری و فنی لوازمات سے بھرپور ہے۔ ان کی غزلیں خیالات اور لطیف جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ جہاں ان کے کلام میں دلچسپ تصویریں اور تمثالیں ملتی ہیں وہیں ان کے کلام میں مشاہدے کی فنکاری اور جزئیات کے ساتھ منظر نگاری کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گماں کے سائے میں گرداں ہماری گلیوں میں
سکوں سے سوئے ہوؤں کو جگا کے چلتے بنے(۱۰۰)

کٹیا میں مر گیا علی یاسر، کمال ہے
دربار کی طرف کبھی چہرہ نہیں کیا(۱۰۱)

علی یاسر کے ہاں منظر نگاری کا ہنر بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن کے کلام میں زندگی کے رنگوں کی چھوٹی چھوٹی تصویریں اور تلخ و شیریں کیفیات کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ رزق اور غربت کے مناظر کو تخلیقی انداز میں غزل کا حصّہ بناتے ہیں۔ اُن کے ہاں کیفیات کے مناظر بھی عمدگی سے پیش کیے گئے ہیں۔

اب یہ گستاخ نگاہوں سے شکایت کیسی
پیرہن آپ ہی بیباک پہن کر آئے(۱۰۲)

علی یاسر کی غزل میں جمالِ زیست کے مناظر اپنی رنگینیوں اور تلخیوں کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ اُن کی غزلیں اُن کے مشاہدے اور جزئیات نگاری کا دلکش نمونہ ہیں۔ علی یاسر کی غزل میں جہاں زندگی کی خوشیوں اور غموں کے رنگ ملتے ہیں وہیں ہجر و وصال، عشق، غربت، شاہ کا دربار اور زمین و آسمان کے رنگوں کی جزئیات کے ساتھ تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ علی یاسر کی غزلوں میں مکالماتی انداز اور تمثال کاری کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کا رنگ بھی بھرپور صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اے اشک روانہ ہوتے لمحے
پچھلی برسات یاد رکھنا(۱۰۳)

علی یاسر کی غزل میں فنی بالیدگی اور جمالیاتی ہنر کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ اپنے تخیل، مشاہدے اور جمالیاتی ذوق کو تخلیقی اظہار کا حصّہ بناتے ہیں، علی یاسر کے کلام میں معاصر شعری اسلوب کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ تمثالی اسلوب اس عہد کی غزل کا بہت مرغوب انداز ہے۔ جزئیات کے ساتھ مناظر کو پیش کرنا اس

عہد کے شعرا کا خاص انداز ہے۔ علی یاسر بھی ہجر و وصال کی کیفیات اور زندگی کی بے ثباتیوں اور محرومیوں کو دلکش تصویروں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

زبان و بیان

علی یاسر کی غزل گوئی زبان و بیان کے اعتبار سے ایک باہنر اور فنکارانہ صلاحیتوں کے حامل تخلیق کار کی شاعری ہے۔ ان کا کلام ایک طرف فکری بالیدگی کا مظہر ہے تو دوسری طرف زبان کی لطافتوں، تشبیہات، استعارات، صنائع بدائع اور روز مرہ محاورات کے عمدہ استعمال کی بدولت بھی نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں دلکشی اور معنی خیز تشبیہات دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی تشبیہات ان کے فن پر دسترس اور فن سے آگاہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کے اشعار میں تشبیہات کی مثالیں ملاحظہ کریں:

اے اشک! روانہ ہوتے لمحے
پچھلی برسات یاد رکھنا (۱۰۴)

تشبیہ سے مراد کسی خاص وصف کی وجہ سے کسی دوسری شے کی مانند قرار دینا ہے۔ علی یاسر نے بھی غزل گوئی میں تشبیہات کا جابجا استعمال کیا ہے۔ جیسے انہوں نے اشک رواں کو برسات سے تشبیہ دی ہے۔

مجنوں میری شکل بنائے پھرتا ہے
مجنوں جیسی حالت کرنا چاہی تھی (۱۰۵)

علی یاسر کی غزل میں جہاں عمدہ تشبیہات ملتی ہیں وہیں اشعار میں معنویت سے بھرپور استعارے بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں استعاروں کی مثالیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ علی یاسر کی غزل فکر و فن کے اعتبار سے بھرپور جاذبیت اور ندرت آمیز لہجے کی غزل ہے۔ اُن کے اشعار میں تلمیحات اور صنعتوں کا استعمال نظر آتا ہے اُن کے کلام میں عشق کا موضوع تنوع کے ساتھ موجود ہے۔ اُن کے کلام میں عشقیہ روایت کی تلمیحات کو بھی خصوصاً برتا گیا ہے۔ اُن کی غزل میں تلمیحات کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ علی یاسر کے کلام میں فنی تنوع قابلِ توجہ ہے۔ اُن کے ہاں محاورات کا استعمال بھی فنی پختگی کی دلیل ہے۔ ان کے کلام میں استعارات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا یا مانگنا کے ہیں۔ ڈاکٹر مزمل حسین کے نزدیک:

"علمِ بیان کی اصطلاح میں استعارہ اس لفظ کو کہتے ہیں۔ جو حقیقی معنی کی بجائے غیر حقیقی یا مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق پایا جائے یعنی الفاظ کے حقیقی معنی کا لباس عارتاً لے کر مجازی معانی کو پہنانے کا نام ہے۔" (۱۰۶)

علی یاسر کی شاعری میں نادر استعارات اور جدت آمیز لفظوں سے رچی بسی ہوئی ہے۔ اُن کے ہاں زبان و بیان کا عمدہ سلیقہ موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے دلکش استعارے ملتے ہیں:

ہم نے دروازۂ مژگاں پہ سجا رکھا ہے
وہ ستارہ کہ جو تسخیر نہیں ہو سکتا (۱۰۷)

ستارہ ٹوٹ کے پہلے پہل تو رویا تھا
مگر زمیں پہ اب کہکشاں بلاتا ہے (۱۰۸)

علی یاسر کی شاعری میں زندگی اور عشق کے مختلف پہلوؤں سے متعلق دلکش استعارے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال ان کی فنی ہنروری کی دلالت کرتا ہے۔ علی یاسر نے اپنی شاعری میں جدت آمیز تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں تراکیب کی انفرادیت ہے۔ انھوں نے روایتی لفظوں اور تراکیب کو بھی جدت اور ندرت عطا کی ہے۔ ان کے ہاں منفرد اضافتوں کے ساتھ تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ علی یاسر کے ہاں صنائع بدائع کا استعمال ان کی فنی چابک دستی کو ظاہر کرتا ہے۔ علی یاسر کی غزل میں صنعتِ تضاد کا بھی استعمال نظر آتا ہے صنعتِ تضاد شعر میں موجود ایسی دو چیزوں کو کہتے ہیں جن میں تضاد کی کیفیت پائی جائے۔ ان کی شاعری میں صنعتِ تضاد کا فنکارانہ سطح پر استعمال ملتا ہے جیسے ایک طرف فراق اور دوسری طرف وصال کی بات کی گئی ہے۔ اس حوالے سے مثال ملاحظہ کریں:

ترا فراق میرا حوصلہ بڑھاتا ہے
ترے وصال کے منظر ہیں میرے سینے میں (۱۰۹)

علی یاسر نے اس صنف میں اپنے کلام کی ایک چیز کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ساتھ اس سے تعلق رکھنے والی دوسری شے کا بھی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے جس میں سائل کا آنا دعا دینا وغیرہ شامل ہے اس طرح انھوں نے صنعتِ مراعاۃ النظیر کا استعمال بھی کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

سائل کاسہ دراز آیا، دعا ریز ہوا
شہ نے واپس اسی کاسے میں دعا رکھ دی تھی (۱۱۰)

مجموعی طور پر ہم کہ سکتے ہیں کہ علی یاسر نے زبان و بیان، محاورات، تراکیب کے عمدہ استعمال تلمیحات، تشبیہات استعارات، صنعتوں اور نئے مرکبات کے ساتھ غزل کو نئے انداز میں استوار کیا ہے۔ ک صنائع بدائع ان کے اسلوب کی دلکشی جاذبیت اور نغمگی لبریز پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ یہی انفرادیت

انھیں معاصر غزل گو شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔ علی یاسر کی غزلیات فنی اعتبار سے بھی اپنا بھرپور اعتبار قائم کرتی ہیں۔ ان کی شاعری وسیع معنوں میں زبان و بیان کی پختگی اور آلام زمانہ کی مختلف صورتوں کی عکاس ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صدام ساگر، صدائے ساگر، (غزل بتائے گی کی تقریب پذرائی)، مشمولہ، روزنامہ پاکستان ۱۲مارچ ۲۰۱۸

۲۔ فیروز اللغات اُردو جدید، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ص ۳۸۵

۳۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۱۸، ص ۱۳۰

۴۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۱۵، ص ۲۶۵

۵۔ محمد حسن، پروفیسر، اردو ادب میں رومانوی تحریکیں، انجمن ترقی اردو ہے۔ آر۔ آفیسٹ پرنٹر نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص ۱۳

۶۔ محمد حسن، پروفیسر، اردو ادب میں رومانوی تحریکیں، ۱۹۹۹، ص ۱۴

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴، ص ۸۶

۸۔ علی یاسر، ارادہ، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۱۶

۹۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۸۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۱۱۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۲۲۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۱۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۳۵۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۱۷۶

۳۶۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۱۲۶

۳۷۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۱۷۳

۳۸۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۱۵۲

۳۹۔ ایضاً، ص ۹۴

۴۰۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۲۰

۴۱۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۱۳۴

۴۲۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۱۷۹

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۷

۴۴۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۱۴۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۴۷۔ ایضاً، ص ۸۶

۴۸۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۳۳

۴۹۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۵۹

۵۰۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۵۷

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۶

۵۲۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۴۸

۵۳۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۲۷

۵۴۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۴۶

۵۵۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۳۳

۵۶۔ ایضاً، ص ۴۹

۵۷۔ ایضاً، ص ۴۶

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۵۹۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۷۹

۶۰۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۱۳۹

۶۱۔ علی یاسر، ارداہ، ص ۱۰۴

۶۲۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۹۲

۶۳۔ علی یاسر، ارادہ، ص ۱۴۲

۶۴۔ ایضاً، ص ۴۷

۶۵۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص ۹

۶۶۔ علی یاسر، حمد، مشمولہ: ادبِ عالیہ (کتابی سلسلہ) فرید پبلشرز، اردو بازار کراچی، شمارہ: ۷، ۶، ۶۴

۶۷۔ علی یاسر، حمد، مشمولہ: مدحت (سہ ماہی)، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۴۲

۶۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۶۹۔ علی یاسر، مثنوی، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص۴۹۷

۷۰۔ ایضاً، ص۴۹۷

۷۱۔ رفیع الدین اشفاق، سید، ڈاکٹر، اردو میں نعتیہ شاعری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۶، ص ۵۴

۷۲۔ علی یاسر، نعت، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ۱۱۳

۷۳۔ ایضاً، ص۱۱۳

۷۴۔ علی یاسر، نعت رسول مقبول، مشمولہ: ماہنامہ ضیائے حرم، مئی ۲۰۰۹، ص ۱۲

۷۵۔ علی یاسر، مرثیہ، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص، ۵۲۳

۷۶۔ علی یاسر، مستزاد، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص ۵۰۱

۷۷۔ امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۶، ص ۱۹۰

۷۸۔ علی یاسر، سلام، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص۲۳۵

۷۹۔ علی یاسر، مسدس، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص۵۴۹

۸۰۔ علی یاسر، ملی نغمہ، مشمولہ: ادبِ عالیہ ص، ۴۴۹

۸۱۔ علی یاسر، نظم: گڈ مارننگ فلاورز، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص، ۴۰۲

۸۲۔ علی یاسر، نظم: حساب، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص، ۴۰۱

۸۳۔ علی یاسر، ماہیے، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص، ۴۵۴

۸۴۔ علی یاسر، قطعات، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص، ۴۲۵

۸۵۔ علی یاسر، ہائیکو، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص، ۲۶۲

۸۶۔ علی یاسر، نثری نظم، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص۳۵۶

۸۷۔ علی یاسر، آزاد نظم، مشمولہ: ادبِ عالیہ، ص۳۲۰

۸۸۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص۵۷

۸۹۔ علی یاسر، ارادہ، ص۱۹

۹۰۔ ایضاً، ص۱۶

۹۱۔ ایضاً، ص۱۷

۹۲۔ ایضاً، ص۸۷

۹۳۔ ایضاً، ص۵۹

۹۴۔ ایضاً، ص ۳۱

۹۵۔ ایضاً، ص ۲۲

۹۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۹۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۹۸۔ ایضاً، ص ۴۴

۹۹۔ ایضاً، ص۴۸

۱۰۰۔ علی یاسر، غزل بتائے گی، ص۲۸

۱۰۱۔ علی یاسر، ارادہ، ص۱۰۴

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۰۴

۱۰۳۔ ایضاً، ص۵۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص۵۲

۱۰۵۔ ایضاً، ص۶۳

۱۰۶۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، اُردو میں علم بیان اور علمِ بدیع کے مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص۱۰۴

۱۰۷۔ علی یاسر، ارادہ، ص۲۷

۱۰۸۔ ایضاً، ص۱۱۵

۱۰۹۔ ایضاً ص۶۸

۱۱۰۔ ایضاً، ص۲۵

باب سوم

علی یاسر کی متفرق ادبی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ

بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں جب جدید ذرائع ابلاغ نے فروغ پایا اور زبان کے حوالے سے فاصلے سمٹنے لگے تو ادب میں بھی تبدیلیوں کے امکانات پیدا ہونے لگے۔ جدید وسائل سے جہاں رابطوں میں تیزی آئی وہاں ادب کی جمالیات پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے۔ مختلف نظریات کا نفاذ اور مختلف زبانوں کے اشتراکات کی وجہ سے ادب میں منفی اور مثبت دونوں رویے نظر آنے لگے۔ نیز اس امر کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ سماجی تیز رفتاری کے اس زمانے میں ایسی نثر کا بقا ہو جو روایت سے بھی جڑی ہو اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی، تا کہ کلاسیک کی تفہیم کے لیے بھی نئے اذہان تیار رہیں اور زبان کے جدید تناظر سے بھی آگاہ رہیں۔ اس ضرورت کو جن چند ادیبوں نے محسوس کیا اور اپنی تحریروں کو ان تناظرات میں پیش کیا ان میں ڈاکٹر علی یاسر کی نثری خدمات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کی نثری خدمات میں تحقیقی مضامین، تعارفی مضامین، نثری تراجم اور سکرپٹس شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایم فل کا مقالہ "کلیاتِ منظور عارف: تحقیق و تدوین" جو کتابی صورت میں طباعت کے مراحل میں ہے اور پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا" جو کتابی صورت میں فروری ۲۰۲۰ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہو چکا ہے۔

الف۔ علی یاسر بحیثیت محقق اور نقاد

ا۔ تحقیقی کتب

علی یاسر کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلے ایم فل کا تحقیقی و تنقیدی کام کلیات منظور عارف: تحقیق و تدوین ہے۔ اس مقالے کا انتساب علی یاسر نے اپنے والدین اور شریکِ حیات کے نام کیا۔ مقالے کے دوسرے صفحے پر منظور عارف مرحوم کی ایک یادگار تصویر لگی ہوئی ہے۔ اس مقالے میں منظور عارف کے مختصر حالاتِ زندگی، خاندانی پس منظر، پیدائش اور تعلیم، نظریات و روزگار، گھریلو حالات، شادی، اولاد اور وفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ منظور عارف کا پیدائشی نام منظور الٰہی اور قلمی نام منظور عارف تھا۔

آپ یکم ستمبر ۱۹۲۴ء کو پاکستان کے ضلع اٹک کی تحصیل حضرو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک سرکاری ملازم تھے اور ملازمت کی وجہ سے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا تھا۔ ان کی تعلیم کی بات کی جائے تو ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے آبائی گاؤں سے ہی حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء میں راولپنڈی کے گورڈن کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ لاہور کے لاء کالج سے ایل ایل بی کیا۔ انھوں نے پہلی ملازمت بطور انسپکٹر ایکسائیز کے دفتر غازی ضلع ہری پور میں اختیار کی لیکن یہ ملازمت ان کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ ایک ماہ بعد ہی ملازمت سے مستعفیٰ ہوگئے۔ اس کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہوئے اور ان کے اس پیشے کا خاص مقصد مظلوموں کی مدد کرنا تھا۔ منظور عارف کے والد ایک متحمل مزاج انسان تھے اور منظور عارف اپنے والد سے بہت متاثر تھے۔ ان کی طبیعت میں بہت خودداری تھی اور ادب سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ اسی ادب کے ذوق کی وجہ سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز چھاچھی زبان کی شاعری سے کیا۔ ادبی محفلوں میں جانا شروع کیا۔ اس دوران اہل ذوق لوگوں کی طرف سے انھیں بہت عزت واحترام ملا۔ ان کی شاعری کا مقصد معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جبر و استحصالی نظام کا خاتمہ کرنا تھا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ کالم لکھنے کا کام بھی سر انجام دیتے رہے۔ پھر انھیں اپنی ذات کی سچائی اور ایمان داری کی وجہ سے وکالت کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔ اس کے بعد وہ بطور ڈپٹی ڈائریکٹر کراچی کے پریس اینڈ انفارمیشن کے شعبے سے منسلک ہوگئے۔ جس کی وجہ سے انھیں کراچی جانا پڑا لیکن وہاں جاکر اپنے گھر والوں سے دوری اور تنہائی کا احساس بڑھنے لگا اور انھیں شراب پینے کی عادت پڑگئی۔ کراچی میں قیام کے وقت انھوں نے بہت سی نظمیں، غزلیں اور گیت لکھے جن میں اداسی ،تنہائی، ہجر اور کرب جیسے موضوعات نمایاں تھے کیونکہ منظور عارف کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہوتا تھا۔ جب ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کیا تو ترقی پسند تحریک کے رکن ہونے کی وجہ سے بہت سے ملازمین کو برطرف کر دیا گیا جن میں منظور عارف کا نام بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں شدید بے روزگاری کا احساس ہوا۔ دوستوں کی ہدایت پر کچہری میں وکالت کے لیے دفتر بنایا لیکن وکالت میں بھی ان کی دلچسپی برقرار نہ رہ سکی۔ ان کی شریکِ حیات کے ماموں جو چیمبر آف کامرس راولپنڈی کے صدر تھے، ان کی طرف سے پیش کی گئی سیکرٹری کی ملازمت کو منظور عارف نے قبول کیا لیکن وہاں بھی ان کا ضمیر مطمئن نہ ہوا۔ لہٰذا انھوں نے کالم نویسی اور معمولی مشاعروں کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے بعد ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹنگ کا کام کیا۔ عام عوام

کے درد کو محسوس کیا، ان کے لیے مرتے دم تک کام کیا اور خوب شہرت پائی۔ منظور عارف بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ ان کی شریک حیات کا نام مبارک بیگم تھا اور ان کے تین بیٹے اور تین ہی بیٹیاں تھیں۔ روزگار کے غم کی وجہ سے وہ گھر اور اپنی اولاد کو زیادہ وقت نہ دے سکے۔ ان کے بچے بے انتہا کوششوں کے بعد بھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ منظور عارف ایک حساس طبیعت کے مالک تھے اور دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر ۳۰ دسمبر ۱۹۸۰ء کو دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

علی یاسر نے مقالے کے دوسرے حصے میں منظور عارف کی اردو شاعری کا موضوعاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ جب منظور عارف تعلیم و تربیت کے مراحل طے کر رہے تھے تو اس وقت بیسویں صدی کا دور تھا۔ انقلاب، جنگیں، آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ انھوں نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ اس وقت کی سیاست پر علامہ اقبال کی شاعری کے اثرات بہت نمایاں تھے۔ منظور عارف بھی اقبال کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ ان کے شاعری سے شغف کی وجہ ان کا ادبی گھرانہ تھا۔ ان کے والد صاحب علم و ادب میں دلچسپی کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرنے کے شوقین تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے پھوپھو کا بیٹا جو کہ نہ صرف ان کا ہم عمر تھا بلکہ ان کا بہترین دوست تھا، منظور عارف سے روزانہ کافی دیر تک علمی و ادبی گفتگو کرتا، جس سے ان کا ادب کی طرف رجحان مزید پختہ ہو گیا۔

منظور عارف کی شاعری میں بھی دوسرے شعرا کی طرح رومانوی اشعار نظر آتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں رومانوی رنگ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا اور اس کی جگہ ترقی پسندی نے لے لی۔ منظور عارف کی شاعری میں مذہبی رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے جن میں سماجی ناانصافیوں اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔ منظور عارف کو زندگی میں بہت سی مشکلات اور سانحوں کا سامنا رہا، س لحاظ سے آپ ایک مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ دوسری جنگِ عظیم، تقسیمِ ہند، مارشل لاء، بھٹو کی پھانسی، ان ادوار نے منظور عارف کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کو بھی بہت متاثر کیا۔ لہٰذا ان کی شاعری میں مزاحمت بھی نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری کا مقصد ترقی پسندی اور معاشرتی اقدار کو بہتر بنانا تھا۔ علی یاسر کے مقالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"منظور عارف نے بہت سے حالات و سانحات دیکھے تھے، جنگِ عظیم دوم، تقسیمِ ہند کے فسادات مارشل لاء، مشرقی پاکستان کی علیحدگی وغیرہ۔ ان حالات و اقعات نے ان کی طبیعت پر بہت گہرے نقوش مرتب کیے۔ ان کی شاعری میں جہاں دردناک لہجہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے وہیں مزاحمتی شعور بھی نظر آتا ہے۔"(۱)

علی یاسر نے اپنے اس مقالے میں منظور عارف کی غزلوں کا فکری و فنی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کی بنیادی شاعری میں ترقی پسندی اور رومانوی مزاج یکجا نظر آتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد سیاسی و سماجی شعور ان کی شاعری کا موضوع بنا۔ منظور عارف بھی اپنے عہد کے مزاج، فکر اور رجحان سے الگ نہ رہ سکے۔ ان کی شاعری میں جدت اور علامتی انداز نمایاں ہے۔ علی یاسر نے ہر دور کے لحاظ سے ان کی شاعری کے موضوعات کا جائزہ لیا ہے۔ منظور عارف کی ۱۹۵۸ء کی غزلیات میں علامتیں، استعارے اور موضوعات وہی ہیں جو ترقی پسند تحریک کے منشور کو بیان کرتے ہیں۔ مارشل لاء سے لے کر سماجی ماحول اور ملکی حالات بھی ان کی شاعری کا حصہ رہے ہیں کیونکہ انھوں نے تمام ملکی اور بین الاقوامی مسائل اور کرب کو محسوس کرتے ہوئے انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کا شمار بھی جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلیات کے فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں متنوع علامتیں، استعارے اور تلازمات موجود ہیں جنھیں منظور عارف نے نیا انداز دینے کی کوشش کی ہے۔ بقول علی یاسر:

"منظور عارف کی شاعری میں علامات اور تلازمات کی بات کی جائے تو ان کی غزلیات میں دریا کو ایک اہم استعارے اور علامت کی حیثیت حاصل ہے۔ دریا میں موجود طلسمات، جہانِ دیگر، طلاطم، نگینے انھیں شعری معنویت عطا کرتے ہیں۔ اس علامت سے انھیں بے انتہا محبت تھی۔ اسی لیے انھوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام "لہر لہر دریا" رکھا۔ دریا ان کی نظر میں متحرک استعارہ ہے۔"(۲)

علی یاسر نے دوسرے باب کے جزو میں منظور عارف کی نظموں کا مختصر فکری وفنی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس میں ان کی نظموں کے بنیادی مقصد سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی نظموں کے موضوعات میں معاشرتی جبر، جاگیر دارانہ نظام، نا اقتصادی حالات وغیرہ کے خلاف بغاوت شامل ہے۔ ان کی نظموں کے دوسرے دور میں ملکی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر رونما ہونے والے حالات وواقعات کو انھوں نے اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منظور عارف پختہ نظریات کے مالک تھے۔ ان کے ہاں روایات اور مذہبی اقدار بھی ساتھ ساتھ موجود رہیں۔ مقالے کے دوسرے باب میں علی یاسر نے منظور عارف کی چھاچھی زبان کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے پہلے چھاچھی زبان سے مکمل آگہی دینے کی کوشش کی ہے کیونکہ منظور عارف ضلع اٹک کے علاقے چچھ کے رہنے والے تھے اور ان کو اپنے آبائی علاقے سے بے انتہا محبت تھی۔ اسی محبت کی وجہ سے انھوں نے چھاچھی زبان میں شاعری لکھی۔ اس کا بنیادی مقصد بھی ترقی پسندی تھا۔ منظور عارف کی پہلی چھاچھی زبان کی نظم "میںڈے مِنے آں بچاؤ" (میرے بچے کو بچاؤ) جو ۱۹۵۱ کو روزنامہ امروز میں شائع ہوئی۔ منظور عارف نے اپنی نظموں میں بھی سیاسی جبر، جاگیر دارانہ نظام اور ظلم وستم کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ ان کی پہلی چھاچھی نظم کے حوالے سے علی یاسر کے مقالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "منظور عارف کی پہلی چھاچھی نظم ان تمام ماؤں کی نمائندگی کرتی ہے
> جن کے بیٹوں کو زبردستی جنگ کی نذر کر دیا گیا۔ جاگیر دارانہ آمریت
> سے دوچار یہ کرب پورے پنجاب کا دکھ تھا۔ اس نظم کی خوبصورتی یہ ہے
> کہ ان میں تینوں استعماری طاقتوں یعنی جاگیرداروں، ہندو مہاجن اور
> انگریزوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔"[۳]

منظور عارف نے چھاچھی زبان کی شاعری میں جنگ کے خلاف بغاوت، نفرت اور انسان دوستی کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی آبائی زبان میں بیشتر گیت لکھے جس میں عورت کے حسن اور جذبات کی بہترین انداز میں منظر کشی کی گئی ہے۔

"اللہ جانے کون ایا
کِیتھوں آیا کتھے گیا

کوئی ہوسی، مانہہ کیہ اے

او میینڈا الگنا کیہ اے

سوہنا ایا تے تاں کیہ اے

مانہہ اے کینڈی کیہ پروا

اللہ جانے کون ایا

کیتھوں آیا، کتھے گیا"

"اردو ترجمہ (خدا جانے وہ کون تھا، کہاں سے آیا کہاں گیا۔ وہ کوئی بھی ہو مجھے کیا؟ وہ میرا لگتا بھی کیا ہے؟ مجھے کسی کی کیا پروا؟ خدا جانے وہ کون تھا، کہاں سے آیا کہاں گیا۔"[۴]

علی یاسر نے اپنے مقالے میں منظور عارف کی نثر کا بھی ذکر کیا ہے جس میں فیچر، کالم، مضامین، ریڈیائی ڈرامے، رپورتاژ شامل ہیں، جب منظور عارف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو سیاسی انتشار کا زمانہ تھا اسی وجہ سے ان کی نثر میں بھی ہمیں سماجی رویوں اور روز مرہ مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔ علی یاسر کے مطابق:

"حالات و زندگی پر منظور عارف کی گہری نظر تھی یوں ان کی صحافتی تحریروں میں بھی سماجی اور معاشرتی بحث نظر آتی ہے۔ فکاہیہ کالموں میں ہلکے پھلکے انداز میں اپنی بات کا ابلاغ کرنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے کالموں میں کہیں کہیں ڈرامائی انداز تھا اپنے ایک کالم کیمبل پور میں لکھتے ہیں:

منظور عارف کے کالموں میں ڈرامائی انداز ملتا ہے جس میں وہ سماجی زندگی اور عام آدمی کے مسائل کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس کا اندازہ ان کے اپنے کالم مکتوب کیمبل پور میں ملتا ہے:

"وزیر اعلیٰ سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے، جب وفد نے اپنی کہانی ختم کی تو انھوں نے فرمایا:

سنا ہے، وہ سات ملزم جولاہے تھے

وفد نے غرض کی: جی ہاں

وزیر اعلیٰ: آپ میں سے کوئی ان کا رشتہ دار ہے؟

وفد: جی نہیں

وزیر اعلیٰ: تو آپ کو ان سے ہمدردی کیوں ہے؟"(۵)

علی یاسر نے اپنے مقالے میں منظور عارف کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے اور شاعری کو عہد حاضر کی ضرورت قرار دیا ہے۔

علی یاسر نے اپنے اس مقالے کے اختتام پر تدوین کا کام کیا ہے جس میں کلیات منظور عارف غزلیات، نظموں، گیت، قطعات و رباعیات اور چھاچھی زبان میں موجود فہرست اور نگارشات پیش کی ہیں۔اس کے علاوہ ان کی غزلیات اور حروفِ تہجی کے لحاظ سے ردیف وار پیش کی ہیں۔مقالے کے آخری صفحات پر منظور عارف کے ذاتی دستاویزات کے عکس بھی بطور ضمیمہ پیش کیے ہیں۔

علی یاسر کا پی ایچ ڈی کا مقالہ اردو غزل میں تصور فنا و بقا کے موضوع پر مشتمل ہے۔جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔اس کتاب کا انتساب بھی علی یاسر نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔اس کتاب کا پیش گفتار ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے لکھا ہے۔یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب "فنا و بقا کے اصولی مباحث" ہیں۔جس میں علی یاسر نے فنا و بقا کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور مختلف لغات سے فنا و بقا کے مختلف لغوی اور اصطلاحی مفہوم پیش کرنے کے بعد مختلف مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ کی روشنی میں فنا و بقا کے تصوارت کو پیش کیا جو کہ ایک بہترین کاوش ہے۔ مختلف جدید مغربی فلاسفر جن میں البرٹ کامیو، کال مارکس، ہیگل، سوزن کیکارڈ وغیرہ کے تصور کے ساتھ ساتھ مشہور نفسیات دان اور مسلمان مفکرین بھی شامل ہیں۔ امام غزالی، ابنِ خلدون اور شاہ ولی اللہ وغیرہ کی روشنی میں بھی فنا و بقا کے تصور کو بھی پیش کیا گیا ہے۔دوسرے باب کی بات تو "کلاسیکی اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا" ہے۔اس باب کی ابتدا میں اردو زبان کے ابتدائی شعرا جن میں قطب شاہی، عادل شاہی، ولی دکنی اور ایہام گو شعرا کے ادوار کے حوالے سے فنا و بقا کے تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اسی باب میں کلاسیکی عہد (جسے اردو غزل کا زریں دور بھی کہا جاتا ہے) کے مختلف شعرا مثلاً خواجہ میر درد، میر تقی میر، نظیر اکبر

آبادی، بہادر شاہ ظفر، مرزا اسد خان غالب اور داغ دہلوی وغیرہ کے فناوبقا کے حوالے سے تصورات بھی شامل ہیں۔ تیسرے باب کا موضوع "نو کلاسیکی اردو غزل میں تصورِ فناوبقا ہے اس عہد میں مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی وغیرہ جیسے شعرا کا نام شامل ہے۔اس باب میں ان شعرا کے فناوبقا کے تصورات کو علی یاسر نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ چوتھا باب "علامہ اقبال کی اردو غزل میں تصورِ فناوبقا" ہے اس باب کے ابتدائی حصے میں اقبال کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال کے عہد کا معاشرتی اور سیاسی منظر پیش کیا گیا ہے جس میں ان کی مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جدوجہد، افکار اور فلسفے کا ذکر کیا گیا ہے جس کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ علی یاسر نے اقبال کی غزلیات کے موضوع اور اسلوب کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ان کے ہاں تصوف کے رنگ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے ہاں فناوبقا کے تصور کو بیان کیا ہے۔ جبکہ پانچویں باب کی بات کریں تو اس کا عنوان جدید اردو غزل (پاکستان) میں تصورِ فناوبقا ہے۔اس میں علی یاسر نے جدید اردو غزل گو شعرا کی غزلیات کے موضوعات کا ذکر کیا ہے جن میں تجسس، ذہنی کرب اور نفسیاتی مسائل وغیرہ شامل ہیں۔علاوہ ازیں ان شعرا کے ہاں بھی فناوبقا کے جدید تصور کو بیان کیا ہے۔

علی یاسر شاعر ہونے ساتھ ساتھ محقق اور نقاد بھی تھے۔جنھوں نے شاعری جیسی نہایت اہم صنف پر موضوعاتی حوالے سے قلم اُٹھایا۔ اردو غزل میں فناوبقا کے موضوع کو انہوں نے جس واضح انداز سے مختلف مذاہب کی روشنی میں پیش کیا ہے وہ آنے والے محققین کے لیے کارآمد ثابت ہو گا۔ اردو غزل پر مذاہب اور تصوف کے بے شمار اثرات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر انعام الحق جاوید علی یاسر کے فناوبقا کے تصورات کی پیشگی کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> "اس میں فناوبقا کے اصولی مباحث مختلف مذاہب و فلاسفہ کے حوالے سے بہت عمدہ ہیں۔اردو غزل پر پر تصوف اور فنا کے نقوش ان مٹ ہیں۔ ہماری اردو غزل آغاز سے لے کر حال تک تصوف کے زیرِ اثر رہی ہے۔ فناوبقا تصوف کی معروف اصطلاحات ہیں لیکن عام آدمی بھی اس حوالے سے متفکر دکھائی دیتا ہے۔"[۲]

علی یاسر نے اپنی اس کتاب میں اردو غزل میں فناوبقا کی روایت سے لے کر جدید تر غزل کا مطالعہ کر کے غزل کے اس اہم موضوع کے حوالے سے مختلف لغات کی مدد سے فناوبقا کے معنی ومفاہیم کی وضاحت کی ہے اور ان کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ قرآن واحادیث سے مستند حوالوں کے ساتھ مختلف مذاہب کے فناو بقا کے تصورات کو پیش کیا ہے تاکہ انسان کی رہنمائی اور فلاح ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بیشتر تنقیدی کتب سے بھی حوالہ جات پیش کیے ہیں۔ اردو غزل گو شعرا کے ہاں فناوبقا کے تصورات کو واضح کرنے کے لیے ان کے مختلف اشعار کا بھی سہارا لیا ہے۔

۲۔ تحقیقی مضامین

تحقیقی کتب کے بعد علی یاسر کے تحقیقی مضامین کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے ہاں مختلف موضوعات پر مبنی تحقیقی مضامین موجود ہیں۔ جن میں منظور عارف کی شاعری میں "سماجی طرزِ احساس اور ترقی پسندی"، تحقیق میں فرضیے کی اہمیت، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: "ایام گزشتہ کے چند اوراق" کے آئینے میں، اردو شاعری اور شہید کربلا، کتب راشد شناسی شامل ہیں۔

علی یاسر کا تحقیقی مضمون "منظور کی شاعری میں سماجی طرزِ احساس اور ترقی پسندی"، تحقیقی و تنقیدی مجلہ دریافت کے شمارہ نمبر۔ ۱۹ میں شامل ہے۔ یہ شمارہ شعبہ اردو زبان و ادب نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس رسالے کے سرپرست اعلیٰ میجر جنرل (ر) ضیاء الدین نجم [ریکٹر]، سرپرست بریگیڈیر محمد ابراہیم [ڈائریکٹر جنرل]، مدیران ڈاکٹر روبینہ شہناز اور ڈاکٹر نعیم مظہر ہیں۔ اس رسالے میں علی یاسر کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں ان کا عہدہ اور مقام بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ منظور عارف کا انگریزی تعارف لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے منظور عارف کا تعارف اور ان کی حالات زندگی کے بارے میں بتایا ہے، جس میں ان کے بچپن، تعلیم، ملازمت اور شخصیت کے بارے میں تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ یہ مضمون ان کے ایم فل کے مقالے میں سے ہی لیا گیا ہے۔ مقالے میں ان تمام پہلوؤں کو بھرپور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن اس مضمون سے منظور عارف کے حالات زندگی، شخصیت اور ادبی زندگی کو مختصر طور پر سمجھنے میں قاری کو مدد ملتی ہے۔ اس مضمون سے بآسانی ان کی شاعری اور ان کی شاعری کے موضوعات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے مقاصد کو سمجھنے میں رہنمائی ملتی

ہے۔ علی یاسر نے منظور عارف پر تحقیقی مضمون لکھتے وقت مناسب حوالے درج کیے ہیں۔اس کے ساتھ ان کی شاعری سے بھی حوالے پیش کیے ہیں جس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے منظور عارف کے مضمون کا مجموعی جائزہ لکھاہے۔اس مضمون کے آخر میں حوالہ جات بھی درج ہیں۔

"پیام آشنا" علمی و تحقیقی مجلّہ جلد ۱۶، شمارہ ۶۰ میں علی یاسر کا تحقیقی مضمون "تحقیق میں فرضیے کی اہمیت" شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے فرضیے کا مفہوم بیان کیا ہے کہ تحقیقی کام میں دی جانے والی دلیل کو فرضیہ کہتے ہیں۔ فرضیے کی علمی و فنی تعریف کے ساتھ انھوں نے تحقیق میں فرضیے کی اہمیت بیان کی ہے نیز اچھے فرضیے کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے کہ اچھا مفروضہ وہی ہے جو آسان الفاظ میں ہو، حقیقت اور نظریے کے مطابق ہو وغیرہ۔ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کے مطابق:

> "مفروضات زیرِ تحقیق موضوع کی ابتدا، چند معروضات کو بنیاد بنا کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ خاکہ میں موضوع سے متعلق سوالات کے عارضی حل یا ممکنہ نتائج کو (Hypothesis) کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔"
> (۷)

اس کے علاوہ اس مضمون میں محقق سید جمیل احمد رضوی کی کتاب کی روشنی میں فرضیے کے چند نکات بھی پیش کیے ہیں اور فرضیہ لکھتے وقت جو قابلِ توجہ نکات ہیں ان کا ذکر کیا ہے کہ تحقیقی مقالے کے پہلے باب میں فرضیہ لکھا جاتا ہے، اس کے تمام الفاظ واضح ہوتے ہیں اور اس کو لکھتے وقت خیال رکھنا چاہیے کہ سوالیہ انداز کی بجائے بیانیہ انداز اپنانا جائے۔ علی یاسر نے اس مضمون میں تحقیق کے آغاز میں فرضیے کی ضرورت اور اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔اس کے اہم عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے ساتھ دستاویزی تحقیق کی اہمیت میں انھوں نے لکھا کہ اس میں مفروضات بنانے کے لیے گہری نظر اور صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔اس مضمون کے مجموعی جائزے میں انھوں نے کہا ہے کہ حقیقت کی تلاش پر جو تحقیق ہو،اس میں مفروضوں کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ کسی بڑے درجے کی تحقیق میں فرضیے کو قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مضمون کے آخر میں انھوں

نے حواشی و حوالہ جات کے بعد کتابیات بھی پیش کی ہیں۔ اس مضمون سے ہمیں فرضیہ کیا ہے؟ اسے جاننے میں بھرپور مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تحقیق میں ضرورت اور اہمیت کے بارے میں آگہی ملتی ہے۔

ادبیات کا سہ ماہی خصوصی شمارہ: ڈاکٹر نبی خان بلوچ نمبر جو کہ اکادمی ادبیات سے شائع ہوا ہے اس میں علی یاسر نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی ایک اہم کتاب پر مضمون لکھا جس کا نام "ایام گزشتہ کے چند اوراق" ہے۔ اس میں سب سے پہلے انھوں نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان کی تمام تر ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ ایک محقق، لکھاری، ماہرِ لسانیات، مترجم، دانش ور اور ادیب تھے اور مختلف زبانوں میں ان کی علمی و ادبی خدمات موجود ہیں۔ اس مضمون کے ذریعے ڈاکٹر نبی بخش کا تعارف اور ان کی علمی و ادبی خدمات اور شخصیت سے مکمل واقفیت ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ان کی کتاب پر تحقیقی کام موجود ہے۔ اس مضمون میں ان کی کتاب کے صفحات کی تعداد بتائی گئی ہے کہ اس کتاب میں ۱۸۳ صفحات موجود ہیں۔ یہ کتاب ان کی تیسری برسی کے وقت شائع ہوئی۔ کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے علی یاسر نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں ان کے سفر کی مختلف سفری یادداشتیں، تہذیبی و ثقافتی، زندگی کے طور طریقے، جونا گڑھ میں ان کا قیام اور چند اسفار پر موجود مقالہ جات بھی اس کتاب کا حصّہ ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں انھوں نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اعزازات کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تحریر اور اسلوبِ بیان ایسا ہے کہ انسان کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں حواشی و حوالہ جات بھی درج ہیں۔ اس تحقیقی مضمون میں علی یاسر نے نبی بخش بلوچ کا مکمل تعارف کروایا ہے جس سے ان کی شخصیت کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ ان کی تمام علمی و ادبی خدمات جو اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں، اس سے قاری کو بآسانی ان کی خدمات اور کتاب سے متعلق مکمل آگہی ملتی ہے جو ایک بہترین تحقیقی کام ہے۔

علی یاسر کا تحقیقی مضمون "اردو شاعری اور شہیدِ کربلا" ماہنامہ پیام آشنا میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے کربلا کے واقعے کو حقیقی انداز میں پیش کیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے بھی اپنے خاندان کی طرح اسلام کی حفاظت کے لیے اپنی جان کا نذانہ پیش کیا۔ کربلا کا واقعہ ہونے سے لے کر قیامت تک حضرت محمدؐ کے نواسے کو ان کی جرأت و بہادری کی وجہ سے خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا رہے گا۔ فارسی اور عربی کی طرح اردو ادب میں بھی شعرا نے امام حسین کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں ماتم کی

روایت کا بھی ذکر ہے کہ حضرت زینبؑ نے سر زمین کربلا کے شہدا کی قربانیوں کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کے لیے مجالس اور ذکر واذکار کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مضمون کے ذریعے واقعہ کربلا اور جذبۂ حسینی کی اہمیت کے حوالے سے آگہی ملتی ہے۔ اردو شعرا کے حوالے سے علی یاسر نے تمام جدید اور قدیم شعرا کے اشعار کو جس عقیدت سے پیش کیا ہے، اس سے کربلا اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں قاری کو مدد ملتی ہے۔ یزید کا امام حسینؑ سے بیعت اور اس سے انکار شاعری میں علامت اور تلازماتی انداز سے پیش کیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ کس طرح مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں پر بھی اس واقعے کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ نیز غیر مسلموں خصوصاً ہندو اور سکھ مذاہب کے شعرا نے امامؑ کے لیے جس طرح سے مضامین لکھے اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا اس کا اندازہ ان شعرا کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے مختلف شعرا کے اشعار کو منتخب کر کے علی یاسر نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے جو کہ ایک اچھی کاوش ہے۔

ماہنامہ اخبارِ اُردو میں علی یاسر نے ایک تحقیقی مضمون لکھا جس کا عنوان "کتب راشد شناسی" ہے۔ اس مضمون میں ن۔م راشد کی شاعری اور ان کی شخصیت پر شائع شدہ کتب کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جس میں سب سے پہلے انھوں نے ن۔م راشد کے تعارفی کلمات پیش کیے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف کے تعارف کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے جس سے ان کا تمام تر اہم کام سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تمام کتب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے جو کتاب ن۔م راشد پر لکھی اس کا نام "ن۔م راشد شاعر اور شخص" ہے۔ علی یاسر نے اس کا تعارف کروانے کے لیے اس کتاب میں موجود تمام مضامین کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کا سنِ اشاعت، ایڈیشن اور پبلشر کا نام اور اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے صفحات کی تعداد بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کے تعارف کے آخر میں ایک سطر میں کتاب سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے ن۔م راشد کی فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علی یاسر نے ن۔م راشد ایک مطالعہ از ڈاکٹر جمیل جالبی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی کتاب کے ہر باب کا تعارف کروایا ہے۔ اس کتاب کے صفحات اور سن اشاعت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ن۔م راشد کے حوالے سے سیاست اور شاعری از پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب کے تعارف میں فتح محمد ملک کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ اس کتاب کے

ہر باب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ کتاب کا سن اشاعت، پبلشر کا نام اور کتاب کے صفحات کی تعداد بھی لکھی ہے اور ایک سطر میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتاب موضوع اور تحریر کے انداز کے حوالے سے بہترین ہے۔ "لا = راشد" از ڈاکٹر تبسم کاشمیری میں بھی انھوں نے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ کتاب تین برس کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کے ابواب کی تقسیم کا ذکر بھی کیا ہے۔ کتاب کے صفحات کی تعداد اور سن اشاعت کا بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے علی یاسر نے لکھا ہے کہ یہ کتاب طالبِ علم، نقاد اور شاعری کا ذوق رکھنے والے ہر شخص کے لیے کار آمد ہے۔ ان پر لکھی جانے والی ہر کتاب کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت شائع ہونے والی کتاب ن،م راشد شخصیت اور فن از ڈاکٹر ضیاء الحسن کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ن۔م راشد کے خطوط از نسیم عباس احمر، مقالات ن۔م راشد اور ن۔م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام از نسرین راشد میں مصنفین کے تعارف کے ساتھ ساتھ کتب کے صفحات اور سن اشاعت کا ذکر کیا گیا ہے اور ہر کتاب کے تعارف کی آخری سطر میں علی یاسر نے کتاب سے متعلق تعارفی سطور تحریر کی ہیں۔ انھوں نے ن۔م راشد کی شائع ہونے والی تمام کتب کا تعارف کرواتے ہوئے مصنفین کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں راشد کی تمام کتب کے تعارف کو یکجا کر کے احاطہ کیا گیا ہے جو ایک بہترین کاوش ہے۔ یہ تحقیقی کام ادب کے طالب علموں اور نقادوں کے لیے کار آمد ہے۔

۳۔ تعارفی مضامین

علی یاسر کا تعارفی مضمون "۳۰ سالہ سفر کی کہانی "اخبار اُردو کے پہلے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں مقتدرہ قومی زبان اُردو کا مکمل تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو قائم ہوا۔ اس کے پہلے صدر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ اس مضمون میں ادارے کے قیام کے مقصد اور اس کی کاوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کوئی بھی قوم اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہے۔ ہماری قومی زبان اردو ہے۔ اس کو زندہ رکھنے اور بطور دفتری زبان رائج کروانے اور اردو ادب کے فروغ میں اس ادارے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس تعارفی مضمون کا مقصد اس ادارے کے پہلے شائع ہونے والے شمارے، اخبار اردو کا تعارف پیش کرنا ہے۔ علی یاسر نے لکھا ہے کہ اس اخبار کا پہلا شمارہ ۱۹۸۱ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کی قیمت ایک روپیہ تھی اور اس کے سرورق کو ہمارے قومی پرچم کے رنگوں سے سجایا گیا تھا۔ جس پر ماہنامہ اخبار اردو کراچی لکھا تھا۔ اس کے نیچے قائداعظم محمد علی جناح کے خطاب کا ایک اہم اقتباس موجود تھا۔

اس مضمون میں علی یاسر نے اس ادارے سے شائع ہونے والے ماہنامہ اخبار کا مکمل تعارف پیش کیا ہے۔ اس اخبار کے لیے مجلسِ مشاورت میں شامل ہونے والے تمام اہلِ قلم عالم اور دانشوروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس شمارے کے صفحات کی تعداد اور ان پر موجود مواد پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس اخبار میں اردو ادب کی معروف شخصیات اور ان کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق خبریں بھی موجود ہیں۔ اس تعارفی مضمون کے ذریعے ہمیں اس ادارے، اس کے مقصد و اہمیت اور اس کی ادبی کاوشوں سے واقفیت ملتی ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں اپنی قومی زبان اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ادارے کے پہلے شائع ہونے والے ماہنامہ اخبار اور اس کے سرورق، صفحات اور اس میں موجود تمام تر مواد سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ اگر کسی نے اس اخبار کو نہ پڑھا ہو تو بھی وہ اس مضمون کے ذریعے اس سے متعلق تمام تر معلومات سے مستفید ہو سکتا ہے۔

علی یاسر کا تعارفی مضمون "اکادمی ادبیات پاکستان" پاکستانی زبانوں اور اردو ادب کے فروغ میں پیش پیش کے نام سے جولائی-اگست ۲۰۱۷ء کے ماہنامہ اخبارِ اُردو میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ہماری قومی زبان اُردو کی اہمیت، وقار اور فروغ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ یہی وہ واحد زبان ہے جس کے ذریعے ہم متحد ہو کر بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ زبان، رنگ، نسل اور علاقائی اختلافات کو بھی قومی زبان اُردو کے ذریعے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ علی یاسر نے اردو زبان کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "اردو محبتوں کی زبان ہے جو دلوں کو ملاتی ہے۔ اس زبان میں وہ طاقت ہے کہ چھوٹے چھوٹے اختلافات اور قومی تعصبات کو ختم کر سکتی ہے۔ اس زبان میں قومی یک جہتی کا پیغام ہے۔ جو ہر پاکستان کو احساس ذمہ داری سے روشناس کرواتا ہے۔ اردو زبان بولنے اور اختیار کرنے سے بہت سی بے بنیاد نفرتیں ختم ہو سکتی ہیں۔"(۸)

اس مضمون میں علی یاسر نے اکادمی ادبیات کے قیام، اس کی اہمیت اور اس ادارے کے لیے جن شخصیات نے خدمات انجام دیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ اس ادارے کا قیام یکم جولائی ۱۹۷۶ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوا۔ اس ادارے کے پہلے چیئر مین ڈاکٹر شفیق الرحمٰن تھے۔ علی یاسر لکھتے ہیں کہ:

> " اب تک اکادمی ادبیات کے چیئر مین کے طور پر خدمات انجام دینے والوں میں پریشان خٹک، احمد فراز، غلام ربانی، فخر زمان، نذیر ناجی، افتخار عارف اور ڈاکٹر قاسم بگھیو جیسے معروف ادیب اور سکالر شامل تھے۔ "(۹)

اس ادارے نے پاکستانی زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے بے شمار منصوبے شروع کیے۔ اس ادارے کی بدولت پاکستانی زبانوں اور اُردو کی ترویج اور اشاعت، تحقیق و تراجم، غیر ملکی، بین الصوبائی اور علاقائی سطح پر رہنے والے تمام اہلِ قلم افراد کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع ملے۔ علی یاسر کے اس مضمون میں جن شعبوں نے ادبی سر گرمیاں سر انجام دیں، ان کا بھی ذکر ملتا ہے۔

اس مضمون میں سہ ماہی مجلہ ادبیات، ششماہی انگریزی رسالہ " پاکستانی لٹریچر "، ماہنامہ "خبر نامہ اکادمی"، سالانہ انتخاب پاکستانی ادب (شاعری / نثر)، کتابیات پاکستانی ادب، پاکستانی ادب کے معمار، صوفی شعرا، بین الاقوامی تراجم، متفرق مطبوعاتی منصوبے، ادبی تقاریب، قومی و بین الاقوامی اہلِ قلم کانفرنسیں، کتاب میلے، کمالِ فن ایوارڈ، قومی ادبی ایوارڈ، شاہ عبد اللطیف بھٹائی اور تصوف ایوارڈ، بین الاقوامی ایوارڈ فار لٹریچر اینڈ ڈیموکریسی وغیرہ کے قیام اور ان کی تخلیق کے مقاصد کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے میں موجود کتاب گھر اور لائبریری کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس ادارے کی لائبریری میں تمام تر علمی و ادبی کتب اور جرائد موجود ہیں۔ اسی طرح اکادمی کتاب گھر میں بھی تمام علمی و ادبی موضوعات پر مبنی کتب، رسائل رعائتی قیمت پر دستیاب ہیں۔

علی یاسر نے اس مضمون کے ذریعے اس ادارے کی علمی و ادبی سر گرمیوں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اس ادارے کی کاوشوں کو یکجا کر کے انھیں روشناس کروانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ اس مضمون کے

ذریعے اس ادارے اور اس میں ہونے والی تمام تر سرگرمیوں کو جس انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے اس سے قاری کو بآسانی اس ادارے کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

علی یاسر کا تعارفی مضمون "نعتیہ محفلِ مشاعرہ "نسبت میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے محققانہ انداز اور خوش اسلوبی کے ساتھ نعتیہ محفل کی کارروائی کو پیش کیا ہے۔ یہ نعتیہ مشاعرہ جشن عید میلا دالنبی کے سلسلے میں معروف ادیب اور شاعر کے گھر اسلام آباد میں منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت شاعر ڈاکٹر توصیف تبسم اور نظامت علی یاسر نے کی۔ اس محفل کے آغاز میں عمار علی یاسر نے مدح پیش کی۔ اس محفل میں دوسرے شہروں سے تشریف لانے والے مہمان شعرانے بھی شرکت کی۔ علی یاسر نے اس محفل کا احوال اور اس میں شرکت کرنے والے شعرا اور ان کے پیش کردہ نعتیہ کلام کا بھی ذکر کیا ہے۔ علی یاسر کے مطابق:

> "بارگاہ نبیؐ میں سب نے اپنے اپنے نعتیہ نذرانے پیش فرمائے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں، علی یاسر، حلیم قریشی، آصف نواز، علی اکبر ناطق، سید آل عمران، دُر شہوار توصیف، اختر رضا سلیمی، نصرت مسعود، عابدہ تقی، شہباز صفدر، ادریس بابر، محمودہ غازی، نذر عابد، نورین طلعت عروبہ، منظر نقوی، اصغر عابد، انجم خلیق، خاور اعجاز، محسن شیخ، نسیم سحر، ڈاکٹر انعام جاوید، سرفراز شاہد، سجاد بابر، انوار فیروز اور صدرِ محفل مشاعرہ جناب ڈاکٹر توصیف تبسم نے کلام پیش کیا۔"(۱۰)

اس نعتیہ مضمون کی پیش کش سے علی یاسر کی تحقیقی و تنقیدی سنجیدگی اور ادبی ذوق کی خوش اسلوبی واضح ہوتی ہے۔ علی یاسر نے اپنے اس مضمون میں اپنے بھرپور مشاہدے سے نعتیہ محفل کے تمام پہلوؤں نعت گو شعرا اور پڑھے گئے کلام کو پیش کیا ہے۔

علی یاسر کا تعارفی مضمون " نظریاتِ فن و جمال: از ڈاکٹر اقبال آفاقی ،ماہنامہ اخبارِ اُردو میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں فن اور جمال کے مباحث کو تجزیاتی انداز میں زیرِ بحث لایا ہے۔ انھوں نے مختلف فلاسفروں اور دانشوروں کی پیش کردہ تعریفوں کی روشنی میں تصورِ جمال اور تصورِ فن کو سمجھانے کی

کوشش کی ہے۔ فن اور جمال دونوں فلسفیانہ موضوعات ہیں۔ فن یعنی آرٹ اس میں موسیقی، مصوری، سنگ تراشی وغیرہ شامل ہوتی ہے۔ فن کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

"حسن، خیال اور جذبات کے تخلیقی اظہار کا نام آرٹ ہے۔ یہ جمال آفرینی کا ذریعہ ہے۔ زندگی کے مختلف واقعات و مشاہدات کو خوبصورت لفظوں میں بیان کرنا آرٹ کا اولین مقصد ہے۔ آرٹ میں ادب و موسیقی، بت تراشی اور مصوری کی اقسام کو لے لیتے ہیں۔ ان سب اصناف میں در حقیقت حسن کی ایک لطیف عمل داری موجود ہوتی ہے جیسے آرٹ فطری انداز میں فن پارے کے ذریعے پیش کرتا ہے۔"[۱۱]

مختصر یہ کہ فن کا تعلق مختلف فنون سے ہے، جیسے موسیقی، مصوری، سنگ تراشی وغیرہ اور جمال کا تعلق انسان کے ذوق سے ہے۔ جمال سے انسان کے حواس متاثر ہوتے ہیں اور انھی کی بدولت انسان مختلف چیزوں کا ادراک کرتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ پروفیسر انور جمال کے مطابق:

"جمال، فنون کی سب سے اہم اصطلاح ہے، جس کا واضح مفہوم حسن، رعنائی، خوبصورتی ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے قطع نظر ادبی و فنی اصطلاح کے طور پر "جمال" کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔ "کسی فن پارے کا وہ تاثر جو اسے دیکھنے، سننے، پڑھنے، سمجھنے یا محسوس کرنے کے بعد روحِ انسانی میں ایک پُر مسرت رنگ پیدا کر دیتا ہے جمال ہے۔"[۱۲]

علی یاسر نے اقبال آفاقی کی اس تحقیقی کاوش کا سر سری طور پر تجزیہ کیا ہے اور کلیدی نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی ذوق اور تحقیقی و تنقیدی بصیرت سے اس فلسفیانہ موضوع پر سر سری تعارف پیش کرنے کی خوبصورت کاوش کی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی شہرت نقاد کی حیثیت سے ہے مگر انھوں نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور ان کا بنیادی شعبہ بھی فلسفہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال آفاقی نے ان فلسفیانہ موضوعات کے بارے میں قلم اُٹھایا ہے۔ علی یاسر لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر اقبال آفاقی کہتے ہیں جمالیات سے میری دلی وابستگی بہت پرانی ہے، زندگی کی ڈھیروں بدصورتیوں کا سامنا کرنے اور لاتعداد دکھ سہنے کے باوجود میرا ایمان خوبصورتی پر کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ زیست کے کینوس پر جب بھی تاریک راتیں طویل ہوئی ہیں، میں نے چودھویں کے چاند کے ملکوتی حسن کے بارے میں سوچا ہے سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کیا ہے۔ بہار کے پھولوں اور مترنم پرندوں کے خواب دیکھے ہیں۔"[۱۳]

علی یاسر نے اس مضمون میں اقبال آفاقی کی کتاب کے ہر باب پر ایک ترتیب سے روشنی ڈالی ہے۔ مختلف فلاسفروں کے نظریات فن اور جمال کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون کے آخر میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس مضمون سے ہمیں اقبال آفاقی کی کتاب اور ان فلسفیانہ موضوعات سے متعلق مکمل آگہی ملتی ہے۔ علی یاسر نے اقبال آفاقی کے اس مضمون کا عمدہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے موضوعات، فن اور جمالیات کے تصورات پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ علی یاسر نے اپنے ادبی شعور اور تنقیدی نقطہ نظر کے ساتھ اس تحقیقی کاوش کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک عمدہ اور معیاری تجزیہ ہے جو علی یاسر کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ب۔ علی یاسر بحیثیت مترجم

علی یاسر نے ترجمہ نگاری کے حوالے سے بھی اپنی شناخت قائم کی۔ انھوں نے ادبی اہداف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ اس ہنر کو استعمال میں لایا ہے۔ اسی وجہ سے علی یاسر کو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے پنجاب کی سرزمین پر بولی جانے والی منتخب زبانوں کا اردو ترجمہ کیا۔ جن میں چھاچھی اور پنجابی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ علی یاسر نے چینی زبان میں موجود منتخب نظموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ علی یاسر کی ترجمہ نگاری پر بات کرنے سے پہلے ترجمہ نگاری کے حوالے سے ماہرین کی آرا اور ترجمہ کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں جاننا ضروری ہے تاکہ ان کی ادبی کاوش کی اہمیت واضح ہو سکے۔

ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ ترجمے کا کردار دنیا کو گلوبل ولیج بنانے میں انتہائی مثبت ہے۔ ترجمہ کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جس متن کا ترجمہ کیا جارہا ہو اُس کا مفہوم اور اس کا خیال قاری تک پہنچ سکے۔ لہٰذا ترجمہ کرنا یقیناً آسان نہیں۔ ہر زبان کے استعارے، محاورے اور تراکیب مختلف ہوتی ہیں اور بہترین ترجمہ وہی ہوتا ہے جو اپنے اصل متن کے لب ولہجے کی ترجمانی کرتا ہو۔ نیز اس کے ساتھ متن کا مفہوم پورے ذائقے کے ساتھ منتقل ہو رہا ہو۔

یوجین نائیڈا (Eugene Nida) نے روایتی اصطلاحات مثلاً free translation, literal translation وغیرہ کے مقابلے میں Dynamic/Functional equivalence کا نظریہ پیش کیا، ان کے مطابق:

> "Translating consists in reproducing in the receptor language the closest natural equivalent of the source language message, first in terms of meaning and secondly in terms of style"(۱۴)

ترجمے کی مدد سے ایک دوسری زبان جس سے قاری انجان ہوتا ہے، کو اپنی زبان میں تبدیل کرتے ہیں تاکہ قاری اس علم سے آشنائی حاصل کر سکے۔ جیلانی کامران کے مطابق:

> " ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے تو اس میں ترجمہ کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی مضمر ہو جاتی ہے۔ وہاں ترجمہ کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خیالات وجذبات کو بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔ نئے الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں۔ پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محاکات دستیاب ہوتے ہیں۔ نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں نئی نئی اصناف کے ساتھ ذہن کا تعارف ہوتا ہے۔ اور فکر اور تحقیق کے نئے نئے سانچے اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔"(۱۵)

ترجمے نے انسانی تہذیب و تمدن میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے اردگرد جتنی بھی ترقی ہوئی ہے وہ سب ترجمے کی ہی بدولت ہے۔ علی یاسر نے بھی تراجم کے ذریعے دوسری زبانوں کے ادب کو اردو میں متعارف کروانے کی کوشش کی ہے اور اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی شعری اور نثری تراجم ادبیات میں شائع ہو چکے ہیں اور چند غیر مطبوعہ بھی ہیں۔

ا۔ شعری تراجم

علی یاسر نے شعری تراجم میں چینی زبان کی چند منتخب نظموں کے تراجم کیے جو "چین کا ادب" عہد بہ عہد شاعری میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں چینی زبان میں موجود مختلف نظموں کے اردو تراجم مختلف لوگوں نے کیے ہیں۔ علی یاسر نے بھی اس کتاب کے لیے چند نظمیں منتخب کر کے ان کے تراجم کیے، جن میں شاعر غیر معلوم کی نظم "انیس قدیم نظموں میں سے"، کاؤزی کی نظم " دریائے لُو کی حسین دیوی"، ژانگ ھوا کی نظم "درباری معلمہ سے ناصحانہ گفتگو"، چھیان چھی (آٹھویں صدی) کی نظم "واپس جانے والے جاپانی بدھ بھگشو کیلئے الوداعی نظم اور "تُو فُو کی نظم "چاندنی رات" شامل ہیں۔ انھوں نے اختر شیخ کی نعت کا پنجابی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا اور جان کیٹس کی نظم (La Belle Dame Sans Merci) کا منظوم ترجمہ "حُسن کی بے رحم ملکہ" کے نام سے کیا جو کہ ابھی تک کہیں بھی شائع نہیں ہوا۔ لہٰذا ضمائم میں اس کی نقل فراہم کی گئی ہے۔ ان کی نظموں کے تراجم میں موزوں الفاظ، ترنم اور موسیقیت کو ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ترجمہ کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اسے علی یاسر نے اپنے فن کے کمال کی وجہ سے بآسانی طے کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے چھاچھی زبان سے منظور عارف کی نظم کا ترجمہ کیا۔ ان کی ترجمہ شدہ نظم کا نام "پرایا گھر" ہے جو کہ سہ ماہی ادبیات کے شمارہ نمبر ۱۰۹ میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے چھاچھی زبان میں موجود منظور عارف کے گیت کا بھی ترجمہ کیا جو کہ سہ ماہی ادبیات کے شمارہ نمبر ۱۱۰ میں شائع ہوا ہے۔ ان کے تراجم کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ انھوں نے کسی دوسری زبان کے ادب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے بلکہ روانی دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی اپنی تخلیق ہو۔ انھوں نے نظموں کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ ردیف اور قافیہ کی بھی پابندی کی ہے۔ دوسری زبان سے ترجمے کا مقصد ہی ادب میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے ادب کو اردو میں متعارف کروانا ہے۔ علی یاسر کی ان نظموں کے تراجم سے دوسری زبانوں کے ادب میں موجود موضوعات سے بھی واقفیت ملتی ہے۔ انھوں نے دوسری

زبانوں کی شاعری کے اردو میں تراجم کر کے ان زبانوں کے خیالات و جذبات کو اردو ادب میں اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے عبارت کے مفہوم کو قاری تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

۲۔ نثری تراجم

علی یاسر نے شعری تراجم کے علاوہ نثری تراجم بھی کیے ہیں۔ انھوں نے پنجابی زبان کی مشہور لکھاری امرتا پریتم کے پنجابی زبان کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانے سہ ماہی ادبیات امرتا پریتم نمبر ۲۰۰۵۔۱۹۱۹ میں شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے جن دو افسانوں کا اردو ترجمہ کیا ان میں "مترا" اور "سفید دھوتی۔۔۔ زردی کا کفن" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس سہ ماہی ادبیات میں ہی ان کا ایک ترجمہ شدہ مضمون بھی شائع ہوا ہے۔ اس کا نام "امروز ہے۔ علی یاسر نے پنجابی زبان میں موجود اس مضمون کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ "مترا" افسانہ ایک باپ اور بیٹی سے متعلق ہے کہ کس طرح ایک باپ بچپن سے اپنی بیٹی کا خیال رکھتا ہے، اس کو پالتا ہے، اس کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے، بیٹی کے ہاتھ اس کو دھوپ میں چھاؤں کی طرح محسوس ہوتے ہیں لیکن جب بیٹی بڑی ہو جاتی ہے تو کس طرح سے اسے اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر جانا ہوتا ہے اور آخر کار بوڑھا باپ بے بس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرا افسانہ " سفید دھوتی۔۔۔ زردی کا کفن "ہے۔ اس افسانے کے ترجمے میں مشرقی معاشرے اور گھریلو مسائل کو پیش کیا ہے کہ کس طرح ساس بہو ایک دوسرے کو اپنانے سے انکار کرتی ہیں اور خود کو ایک دوسرے سے برتر سمجھتی ہیں۔ ساس بہو کو اپنی موجودگی میں گھر کی دہلیز پر آنے سے منع کرتی ہے لیکن بہو بھی اپنی اس ضد کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ ترجمے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "وہ دونوں ایک مرتبہ اُس وقت ملی تھیں جب وہ زندہ تھیں اس وقت ایک کی عمر بیس سال تھی، دوسری کی چالیس برس۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ جس کی عمر بیس برس تھی، اس نے دوسری کی بہو بننے کی ٹھان لی تھی لیکن چالیس برس والی نے اس کی ساس بننے سے صاف انکار کر دیا۔"(۱۶)

اس ترجمے میں "جس کی عمر چالیس سال تھی" اور "جس کی عمر بیس سال تھی" کی تکرار سے ترجمے کا بہاؤ برقرار نہیں رہتا، تاہم الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور یہ ترجمہ بھی طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔

علی یاسر کا تحقیقی مضمون "امروز" سہ ماہی ادبیات میں شائع ہوا۔ امروز اور اس کی نوکری سے کاروبار کا سفر اور اس دوران پیسوں کا ضیاع، پھر بوتیک سے کاروبار کا خاتمہ پھر گھڑیوں کے ڈائل بنانے کا کام پھر اس میں بھی ناکامی، امروز کو یہ علم تھا کہ امرتا ساحر کی محبت میں مبتلا ہے پھر بھی امروز نے جس طرح امرتا کو اپنایا۔ یہ مضمون اس سارے سفر کا ایک خاکہ پیش کرتا ہے۔

> "اس نے دو کی بجائے تین قفل بنائے۔ اس وقت امروز نے میری سوچ اپنی پیشانی میں سمائی ہوئی تھی۔ امروز کو علم ہے کہ میں نے ساحر سے محبت کی تھی۔ یہ علم ہونا کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی مگر اس سے پرے کوئی چیز اس سے بھی بڑی ہے۔ میری ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لینا۔"(۱۷)

اس مضمون کا ترجمہ علی یاسر نے اس خوبصورتی سے نبھایا ہے کہ یہ بالکل طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ علی یاسر نے الیاس گھمن کے افسانے "اگلا بندہ" کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ مختصر یہ کہ وہ ایک محقق اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مترجم کی حیثیت سے بھی سامنے آئے۔

علی یاسر نے نثری تراجم میں نجیب محفوظ کے ایک انگریزی لیکچر کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ سہ ماہی ادبیات کے شمارہ۔ ۷۶ میں چھپا ہوا ہے۔ دراصل جس لیکچر کا علی یاسر نے ترجمہ کیا وہ نجیب محفوظ کا ۱۹۸۸ء میں نوبیل انعام حاصل کرنے کے بعد نوبیل اکیڈمی کے لیے خطبہ تھا۔ جس میں سویڈش اکیڈمی اور نوبیل کمیٹی کی کاوشوں پر ان کا شکریہ ادا کیا گیا اور بہت ہی خوبصورت انداز میں اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ تاریخ اور تہذیب وثقافت کو بھی متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میں دو تہذیبوں کا بیٹا ہوں۔ جن کا سنگم تاریخ کے ایک مخصوص دور میں ہوا۔ ان میں پہلی سات ہزار سال پرانی تہذیبِ فراعنہ ہے جبکہ دوسری چودہ سو سال پرانی تہذیب اسلام ہے۔ شاید مجھے ان دونوں تہذیبوں کو متعارف کروانے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ سب معزز

اور باشعور ہیں لیکن واقفیت اور ہم آہنگی کی موجودہ صورت حال کے
پیش نظر محض یادداشت کے طور پر اس کا تذکرہ کرنے میں کوئی مضائقہ
نہیں۔"(۱۸)

علی یاسر کے تمام تراجم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ برائے ترجمہ نہیں بلکہ وہ ان کی اپنی تخلیق ہو۔ انھوں نے لفظی ترجمے کy بجائے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کاوش کی ہے۔ انھوں نے اپنے تراجم میں کسی قسم کے مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے مصنف کے اسلوب اور تراکیب کا خاص خیال رکھا ہے اور ترجمے کے مفہوم کو قاری تک عام فہم انداز میں پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے تراجم کے ذریعے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی خداداد صلاحیت کو استعمال میں لاتے ہوئے اس کام کو بخوبی انجام دیا ہے۔

۳۔ علی یاسر بحیثیت سکرپٹ رائٹر

علی یاسر نے شاعری، تراجم اور تحقیقی و تنقیدی کام کے علاوہ بطور سکرپٹ رائٹر بھی اپنی پہچان بنائی۔ آپ نے پی ٹی وی کے لیے بھی سکرپٹ رائٹنگ کا کام کیا۔ سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے انھوں نے پاکستان کے سیاحتی علاقوں کی ڈاکومنٹری بنائی اور اس پروگرام کو ترتیب دینے کے لیے پاکستان ریلوے کا سہارا لیا گیا۔ اس ڈاکومنٹری کا مقصد پاکستان ریلوے کی تاریخ اور پاکستان کے اہم، خوبصورت مقامات کی سیر، ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنا اور ان میں بولی جانے والی مختلف زبانوں سے آگاہی دینا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد پاکستان کے ان ثقافتی مقامات کی سیر کروانا تھا جو نظروں سے اُوجھل ہیں۔ اس پروگرام کے میزبان ہائی سکول لیول کے طالب علم اور طالبہ تھے نیز مختلف عمر کے بچوں کا گروپ اس ڈاکومنٹری کا حصہ تھا۔ پروگرام کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے کامیڈی اداکار بھی اس پراگرام کا حصہ تھے۔ ریل کے سفر کے دوران جن مقامات پر پڑاؤ ڈالا گیا ان علاقوں کے لوک رنگ، لوک کہانیاں، لوک روایات کو بھی فنکاروں نے پیش کیا۔ اس سکرپٹ کے ذریعے انھوں نے پاکستان کے خوبصورت اور پسماندہ علاقوں کو معاشی طور پر فعال بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ علی یاسر نے اس سیاحتی موضوع کا سکرپٹ بہت شاندار انداز میں لکھا۔ اس میں الفاظ کا انتخاب اور سیاحتی مقامات کا انتخاب ان کے ادبی ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ سیاحتی پروگرام کا مقصد

لوگوں میں پاکستان کے خوبصورت مقامات کی سیاحت کو فروغ دینا تھا۔ انھوں نے سکرپٹ کو عمدہ اسلوب کے ذریعے منفرد اور دل کش بنادیا ہے۔ اس سکرپٹ میں ان کا جذبہٴ حب الوطنی بھی جھلکتا ہے۔

علی یاسر نے یومِ آزادی کے موقع پر جناح کنونشن میں ہونے والی تقریب کے حوالے سے پی ٹی وی پروگرام کے لیے سکرپٹ تیار کیا۔ اس سکرپٹ کو پیش کرنے والے کرداروں میں فرحان علی آغا اور سدرہ اقبال شامل تھے۔ اس سکرپٹ کو تیار کرتے ہوئے علی یاسر نے ترتیب کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس پروگرام کے آغاز میں معزز مہمانوں کی تقریب میں شرکت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا گیا اور پھر نعتِ رسولِ مقبول پڑھی گئی۔ نامور شخصیات کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اس کے بعد وطن سے محبت کے جذبے کے اظہار کے لیے نغمے پڑھے گئے۔ پھر اس تقریب کی نگران اور دیگر اداروں کا شکریہ ادا کیا گیا۔ نیز طلبا و طالبات کو بھی اس پروگرام کا حصہ بنایا گیا۔ اس سکرپٹ کے ذریعے علی یاسر نے آزادی کے دن کی اہمیت، اس کی تاریخ اور ہمارے بزرگوں کی قربانیوں کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سکرپٹ سے تقریب کا پورا احوال جاننے میں مدد ملتی ہے۔ پاکستان کی مختلف ثقافتوں کے متعلق مکمل آگاہی ملتی ہے۔ پاکستانی عوام کے دلوں میں آزادی اور وطن سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس ملک کے لیے قربان ہونے والی اہم شخصیات کے بارے جاننے میں مدد ملتی ہے۔ نیز اس سکرپٹ میں علی یاسر کا اپنے ملک سے محبت کا والہانہ جذبہ نظر آتا ہے۔

علی یاسر نے پی ٹی وی کے لیے ۲۰۱۷ء میں قائداعظم کی تقریبِ سالگرہ کے موقع پر بھی ایک سکرپٹ تیار کیا، جس میں کمپئیرنگ کے لیے دو لوگ منتخب کیے گئے۔ ان میں توثیق حیدر اور مونا عالم شامل ہیں۔ یہ تقریب جناح کنونشن میں منعقد کی گئی۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا گیا۔ اس سکرپٹ میں بابائے قوم کی سالگرہ کی مبارک باد پیش کی گئی۔ اس سکرپٹ میں علی یاسر نے روانی و تسلسل کا خاص خیال رکھا ہے۔ سادہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس سکرپٹ میں بچوں کی بھی بھرپور شرکت نظر آتی ہے۔ اس کا مقصد قیامِ پاکستان سے پہلے کے زمانے میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم سے آگاہی دینا، مسلمانوں کا آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا اور قائداعظم محمد علی جناح کا مسلمان قوم کو متحد کرنے اور پاکستان بنانے کے عزم اور اس کو ہمیشہ زندہ اور باوقار بنانے کی کوشش کو اجاگر کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری نوجوان نسل میں

مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم، ان کی قربانیوں، اس الگ وطن پاکستان کی اہمیت، ہمارے قائد کی اس امانت کو ہمیشہ زندہ رکھنے اور اس کی حفاظت کا عزم پیدا کرنا تھا۔

علی یاسر نے پی ٹی سی ایل ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے منعقد ہونے والے پروگرام بہار سخن کی میزبانی کی جس میں سب سے پہلے انھوں نے تمام معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ علی یاسر نے اپنا تعارف پیش کیا اور بتایا کہ اس بہارِ سخن میں ملک بھر اور کچھ بیرونِ ملک سے سنجیدہ اور کچھ مزاحیہ شعرا تشریف لائے ہیں۔ اس پروگرام کے صدارت افتخار عارف نے کی۔ امجد اسلام امجد اس پروگرام کے مہمانِ خصوصی تھے۔ علی یاسر نے شعرا کے لیے تعارفی کلمات ادا کیے۔ اس پروگرام کی میزبانی انھوں نے بہت شائستگی سے کی۔ باری باری تمام شعرا نے اپنا کلام پیش کیا اور اس محفل کے کامیاب اختتام پر علی یاسر نے اس پروگرام کو ترتیب دینے والے تمام ٹیم ممبران کا شکریہ ادا کیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو علی یاسر نے بطور سکرپٹ رائٹر اپنے اسلوبِ بیاں اور ہنر کو منوایا ہے۔ ان کے جملے، الفاظ کا چناؤ بھی عمدہ اور معیاری ہے۔ ان کے ہاں حُب الوطنی کے حوالے سے خاص قسم کا حوصلہ اور جوش پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ وطن سے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر امن و امان کی فضا قائم کرتے ہیں۔ جس سے عام شخص آزادانہ طور پر وطن کی محبت کے جذبے کے تحت ملک و قوم کی خدمت کرنے کا عزم محسوس کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علی یاسر، (مرتب) کلیات منظور عارف: تحقیق و تدوین، ص۲۶

۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۔ ایضاً، ص۔ ۴۸

۵۔ منظور عارف، کالم، "مکتوب کیمبل پور" روزنامہ تعمیر، راولپنڈی، ۱۱ ستمبر، ۱۹۵۳، ص ۳۹

۶۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پیش گفتار، اردو غزل میں تصور فنا و بقاء، ڈاکٹر علی یاسر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۰، ص ۱۱

۷۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اُردو میں اُصولِ تحقیق، ورڈوژن پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۶، ص ۲۱

۸۔ علی یاسر، اکادمی ادبیات پاکستان، اخبارِ اُردو، ماہنامہ، اسلام آباد، جولائی۔اگست، ۲۰۱۷ ص ۶

۹۔ ایضاً، ص ۴

۱۰۔ آلِ عمران، سید، (مرتب) نسبت، مراسم پبلشرز، کوٹ سیداں، ۲۰۱۲، ص ۱۸۰

۱۱۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، فروری ۲۰۱۵، ص ۹۳

۱۲۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، اصطلاحات، بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۷، ص ۳۶

۱۳۔ علی یاسر، نظریات فن و جمال، از: ڈاکٹر اقبال آفاقی، اخبارِ اُردو، ماہنامہ، اسلام آباد، جون ۲۰۱۸، ص۔ ۴۴

۱۴۔ Eugene A. Nida, The Theory and practice of Translation, Brill Academic 2003 Publications, Netherlands,

۱۵۔ خلیق انجم، (مرتبہ) فن ترجمہ نگاری، ثمر آفسٹ، دہلی، ۱۹۹۴، ص ۲۷

۱۶۔ علی یاسر، سفید دھوتی زردی کا کفن (ترجمہ)، ادبیات: امرتا پریتم نمبر ۲۰۰۵۔۱۹۱۹ (سہ ماہی) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص، ۷۷۰

۱۷۔ علی یاسر، امروز (ترجمہ)، ادبیات: امرتا پریتم نمبر، ص ۹۰۱

۱۸۔ علی یاسر، نوبیل لیکچر (ترجمہ)، ادبیات شمارہ ۷۶، ص، ۲۸۲

باب چہارم

مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

علی یاسر کا شمار معاصر اردو ادب کے لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کم عمری میں ہر صنف پر طبع آزمائی کی لیکن شاعری میں انھوں نے اپنی الگ شناخت قائم کی اور خوب شہرت پائی۔ ان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کے دوران بہت سی مشکلات کا سامنا کیا لیکن ہمت نہ ہاری۔ بہادری سے تمام مشکلات کا سامنا کیا اور ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ آپ بچپن سے ہی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ بارہ سال کی عمر میں انھوں نے شاعری کا آغاز کیا اور پہلی غزل لکھی۔ شاعری کا شوق انہیں اپنے داداجان سے ورثے میں ملا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی آتی گئی۔ وہ اپنے دو شعری مجموعوں کے ساتھ اپنی الگ ادبی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی جن میں حمد، نعت، سلام، منقبت، گیت، ماہیے اور نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور اے ٹی وی کے لیے سکرپٹس، دستاویزی فلمیں اور ملی نغمے بھی لکھے۔ ان کی تحقیقی کتاب "اردو غزل میں تصورِ فنا وبقا" ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے تحقیقی و تعارفی مضامین بھی لکھے۔ مترجم کی حیثیت سے انگریزی اور پنجابی سے اردو میں کئی شعری اور نثری تراجم بھی کیے۔ جو اکادمی ادبیات کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ علی یاسر نے اہلِ قلم ڈائریکٹری مرتب کی۔ جن میں تمام ادبی شخصیات کے کوائف کو اکٹھا کر کے شائع کیا گیا۔ علی یاسر جدید اردو ادب کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید صنعتی اور مشینی دور کے مسائل، تنہائی اور نفسیاتی الجھنوں کو بھی برتا گیا ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں شعری ادب میں بہت نکھار اور جدت آئی ہے۔ اس دور کی شاعری میں سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور روحانی کیفیات کے تغیر کو نئے لحن اور نئی لفظیات کے ساتھ تخلیقات کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں اختر عثمان، عباس تابش، آفتاب حسین، ارشد محمود ناشاد، عابد سیال، شاہین عباس، سعود عثمانی، محسن چنگیزی، شناور اسحاق اور علی یاسر نمایاں ہیں۔ معاصر ادب میں چاہے وہ نثر تخلیق کرنے والا ہو یا شاعر ہو اس نے جدید دور کے انسان کی تنہائی، ان کو درپیش المیوں، زندگی اور موت کی بدلتی معنویت کو پرکھنے کی سعی کی ہے۔ اس عہد کے تخلیق کاروں نے بے معنی زندگی کے احساس، مشینی زندگی

کے فوائد، نقصانات اور انسانی مصائب کو محسوس کرتے ہوئے بہتر انداز سے اردو ادب میں پیش کیا ہے۔ غرض یہ کہ علی یاسر نے اس تبدیل ہوتے ہوئے سماج کے تنوع کو اپنے تخلیقی شعور کا حصّہ بناتے ہوئے مختلف شعری اصناف میں برتا ہے۔ اکیسویں صدی میں بدلتے ہوئے تناظر اور حالات نے شاعری کو ایک نئی جہت دی۔ فکری سطح پر شاعر متاثر ہوا اور شاعری کے موضوعات کو وسعت ملی۔ معاصر ادب میں بہت سارے شعرا نے اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات سیاسی، سماجی اور عصری رجحانات کو اپنے شعری اظہار کا حصّہ بنایا ہے۔ علی یاسر کی شاعری میں بھی معاصر ادب کے رجحانات کا تخلیقی اظہار واضح طور پر ملتا ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات میں رومانویت، غربت و افلاس، سماجی رویے، زندگی کی بے ثباتی، عاجزی، بے بسی، آزمائش، وطن سے محبت، فنا و بقا وغیرہ شامل ہیں۔ علی یاسر کا شمار موجودہ دور کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل گوئی فکر کے اعتبار سے تنوع کی حامل ہے۔ ان کی غزل میں روایتی اور کلاسیکل غزل کا رچاؤ بھی جھلکتا ہے اور جدید معاصر غزل کے موضوعات بھی ان کی شاعری کی شناخت قائم کرتے ہیں۔ علی یاسر کی شاعری کلاسیکی اور جدت آمیز لہجے کا امتزاج ہے۔ ان کی شاعری کا اسلوب نہایت شیریں اور رومانوی رنگ میں ڈھلا ہوا ہے۔ ان کے ہاں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا اظہار بھرپور رومانوی اور کلاسیکی لہجے میں ملتا ہے۔ محبت کے مختلف روپ ہوں یا غم کے ترانے، ہجر کا دکھ ہو یا وصال کے لمحے علی یاسر نے ایک خاص رومانوی لہجے اور محبت بھری زبان میں اُن کیفیات کو غزل میں برتا ہے۔ رومان اُن کی شاعری کی فضا کی عکاسی کرتا ہے۔ عشق کی کیفیات اور محبت کے لمحات ان کی شاعری میں بھرپور تاثر قائم کرتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی کرچیوں کو جمع کر کے محبت اور عشق کی بکھری آرزو کو جوڑنے اور پرونے کی کوشش کرتے ہیں۔ عشقیہ موضوع پر علی یاسر کی غزل میں بہت سے خیالات ملتے ہیں۔ اُن کے ہاں عشق و حسن کی کشمکش، محبت اور ہجر و وصال کے لمحات کا تخلیقی اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ علی یاسر نے ہجر و وصال کے لمحات کو آزمائش سمجھ کر جیا ہے۔ ان کی شاعری عشق کا کوہِ گراں اٹھانے میں کامیاب رہی ہے۔ وہ عشق کے راستے میں گھبرائے نہیں بلکہ آرزوؤں کی آزمائش میں صبر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علی یاسر زندگی کا مشاہدہ ایک فنکار اور تخلیق کار کے طور پر کرتے ہیں، وہ زندگی کے ذائقوں اور رنگوں سے لطف اندوز ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک انسان زندگی کی رنگینوں اور خوبصورتیوں میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ اس زندگی کے خاتمے کا احساس تک نہیں ہوتا اور اس لمحے کو بھول بیٹھتے ہیں جب موت اپنے رنگ بکھیرنے لگتی ہے اور زندگی کے رنگوں کو موت کے رنگ اپنی آغوش میں لینے لگتے ہیں۔ زندگی کی حقیقت یہی ہے اس کا ایک لمحے کا بھی بھروسا نہیں۔ انسان

جتنا بھی زندگی پر اعتبار قائم کرلے کوئی بھی طاقت ور چیز اُسے موت سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ زندگی فانی ہے۔یہ دنیا عارضی ہے۔ علی یاسر کو اچھی طرح ادراک ہے جتنا مرضی انسان اونچائی پر پہنچ جائے بالآخر زیرِ خاک پہنچتا ہے۔وہ خاک میں ملنے کی حقیقت سے آشنا بھی ہیں اور قائل بھی۔انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز اور مسرت و غم کی کیفیتوں کے مختلف رنگ دیکھے ہیں۔ وہ زندگی کی تگ و دو اور جہدِ مسلسل کے بعد لمبی نیند کے قائل بھی ہیں یعنی انھیں اس حقیقت کا ادارک بھی ہے کہ موت کی نیند ایسی ہے جس میں کوئی مخل نہیں ہوتا۔وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا عارضی ٹھکانا ہے، اصل منزل سوئے افلاک ہے اور وہ اسی منزل کی جستجو اور تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زندگی میں محبوبِ مجازی اور محبوبِ حقیقی کی قربت اور خیالات کی جستجو کرتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ میری زندگی محبت اور عشق میں رقص بسمل کی طرح گزرے۔کیونکہ جب موت نے آنا ہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔وہ اچھی طرح جانتے ہیں موت پر کسی کا اختیار نہیں۔ علی یاسر کے ہاں زندگی کی بے ثباتی کا رویہ بہت واضح ہے۔ان کے ہاں زندگی اور موت کے تصور کے حوالے سے جرأت آمیز تخلیقی اظہار ملتا ہے۔وہ اس المیے کو بیان کرتے ہیں کہ ہم زندگی گزارتے ہوئے زندگی کے رنگوں اور آسائشات کی کیفیتوں میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ زندگی کے مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں اور زندگی عارضی ہونے کا احساس تک نہیں رہتا۔ علی یاسر نے جرأت مندی سے ان حقیقتوں کو اپنی تخلیقات کا حصّہ بنایا ہے۔ ان کے ہاں بے ثباتی کا تصور بہت واضح ہے۔ انھوں نے اس بات کا ادراک کیا ہے کہ زندگی کی خوبصورتی، رنگینی اور آرزوؤں کے باوجود سب کچھ فنا ہونا ہے کوئی چیز دائمی نہیں ہے۔ علی یاسر سماج کی حقیقتوں، سماجی برائیوں اور سماج کے مکروہ چہرے کو تخلیقی اظہار کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کی منافقت اور دیگر رویوں پر برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ مشکل میں لوگ تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔انسان کو خود ہی اپنی مدد کرنی پڑتی ہے۔ایسے میں انسان بہت اکیلا پن محسوس کرتا ہے۔ علی یاسر کے نزدیک ایسے لوگ بھی ہیں جو ضرورت پڑنے پر اجنبی بن جاتے ہیں۔ علی یاسر منافقت اور غیبت کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ طنز کرتے ہیں کہ ایسے بدگمان لوگوں سے پناہ مانگنی چاہیے۔ جو غیبت کرتے ہیں اور کردار کشی کرتے ہیں۔ شاعر اعلیٰ ظرفی سے شرمندہ اور نادم ہونے والوں کو درگزر کرنے پر بھی تیار نظر آتا ہے۔وہ کردار کی اہمیت سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس سماج میں سچائی کے ساتھ چلنا، اس کا ساتھ دینا، سچ کو نبھانا، سچ سننا آسان نہیں۔ اگر لوگ سچ سن کر برا مانتے ہیں مگر شاعر اپنی پرکھوں کی روایت اور سچائی کی روش پر چلنے کی کے لیے تیار ہے۔ وہ اس سماج میں سچ کو اپنانے کا عہد کرتا ہے۔ علی یاسر کے نزدیک سماج یا

معاشرہ ہم سے ہے اور ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ اس کی خرابیاں وہی ہیں جو ہم میں ہیں۔ وہ سماج کی تلخ حقیقتوں کو فنکارانہ اور تخلیقی اظہار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ ان سماجی رویوں کے اثرات خود پر منتقل ہوتے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ خود کو سماج سے کٹتے ہوئے اور بے یقینی کی کیفیات میں الجھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ علی یاسر اپنی سننے کی بجائے سماج کی سنتے ہیں۔ وہ اپنی شہرت پر خوش ہونے کے بجائے پریشان ہیں اور خود سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ علی یاسر کے ہاں سماج میں وعدہ خلافی کا رویہ بھی ملتا ہے۔ لوگ وعدہ کرلیتے ہیں مگر نبھا نہیں پاتے۔ یوں علی یاسر نے سماج میں اخلاقیات کی کمی، منافقت، جھوٹ، غیبت اور وعدہ خلافی جیسے رویوں کو تخلیقی سطح پر برتا ہے۔ علی یاسر اس بات سے پریشان نظر آتے ہیں کہ ہم پابندیوں اور سختیوں پر مطمئن ہیں۔ ہمارے سماج کے لوگ مصلحت، قوت اور طاقتور کے آگے بے زباں ہو جاتے ہیں۔ ان میں جرأتِ اظہار کی کمی آجاتی ہے۔ البتہ شاعر سماج کے برعکس جرأتِ اظہار بھی رکھتا ہے اور جرأتِ گفتار بھی۔ وہ اس سماج میں رہتے ہوئے غلط اور ناانصافی کے خلاف بولنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں سماج کی سختیوں اور ناانصافیوں کے خلاف بولنے اور لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ علی یاسر دنیا کی دشواریوں اور مسائل کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کانٹوں کی سیج ہے۔ پھول چننے کے لیے کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے۔ وہ خود کو اس لحاظ سے بدنصیب تصور کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی غریبی اور مشکلات میں رہ کر گزاری ہے۔ وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی غموں سے بھری ہوئی ہے۔ مگر کچھ لوگ تمام عمر غربت و افلاس سے لڑتے رہتے ہیں، ان کا ماضی بھی غربت کا شکار رہتا ہے اور حال بھی افلاس کے زیرِ سایہ گزرتا ہے۔ علی یاسر کے نزدیک غریب اور مزدور لوگوں کا المیہ یہ بھی ہے کہ ان کو ان کی محنت کے برابر اجرت میسر نہیں آتی۔ ان کی ضروریات کے مطابق انہیں رزق میسر نہیں آتا۔ اس المیے اور دکھ کو انھوں نے شاعری کے ذریعے تخلیقی اظہار کا حصّہ بنایا ہے۔ علی یاسر کی شاعری میں مفلسی، غربت اور رزق کا موضوع تخلیقی اظہار کا حصّہ بنے ہیں۔ علی یاسر نے پیسے کے لالچ کو بھی تخلیقی اظہار کا حصّہ بنایا ہے۔ پیسے کی خاطر لوگ ایمان بیچنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مجرم اور قاتل دولت کے بدلے بے قصور اور معصوم قرار پاتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک غریب لوگ بھی پیسے کے پجاری ہیں۔ دولت ہر ایک کے عیب چھپا دیتی ہے۔ علی یاسر نے مفلسی، غربت اور دولت کی فراوانی کے اثرات اور مسائل کو اپنی شاعری کے موضوعات کا حصّہ بنایا ہے۔ دوسری طرف ان کے نزدیک بیروزگاری، غربت اور معاش کے بوجھ تلے دبا ہوا دل کسی جذباتی وابستگی اور محبوب سے دل لگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسا بوجھل اور ناامیدی سے چور دل عشق کا راستہ کیسے اختیار کرے۔ علی یاسر نے بیروزگاری اور مفلسی کے راستوں کو اپنی شاعری میں فنکارانہ

سطح پر برتا ہے۔ ان کی نظموں کی بات کی جائے تو اس میں انھوں نے کربلا اور اہل بیت کے موضوع کو خاص طور پر اپنی تخلیقات کا حصّہ بنایا ہے۔ چند اہم پابند نظموں میں "سر زمینِ کربلا"، "جشن ولادت امام علیؑ"، "نذرِ ابو طالب" اور سلام شامل ہیں۔ یہی موضوعات ان کی باقی شاعری میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عورت اور مرد دونوں کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ علی یاسر نے جو ملی نغمے لکھے ان میں روایتی طریقے سے وطن سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ علی یاسر کی شاعری کا اسلوب ان کی ادبی خدمات کو تازگی بخشتا ہے۔ اُن کی غزل میں بوجھل پن نہیں بلکہ عمدہ الفاظ کا چناؤ، اسلوب کا اچھوتا پن اور ندرت آمیز لہجہ، اشعار کی روانی اور مٹھاس کو دوچند کرتا ہے۔ اُن کے لہجے میں نہ تو پیچیدہ الفاظ کا استعمال ہے اور نہ ہی مشکل اور بھاری تراکیب کا استعمال دکھائی دیتا ہے۔ وہ روز مرہ اور غزل کی زبان کے نرم و گداز الفاظ کو اپنی غزل کا حصّہ بناتے ہیں۔ جو ان کے اسلوبِ بیاں کو نکھارتا ہے۔ علی یاسر کا اُسلوبِ بیاں ان کی انفرادیت اور جاذبیت کو سامنے لاتا ہے۔ اُن کی غزلیں اُن کے نرم و گداز اُسلوبِ بیاں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔ اُن کے اشعار میں رنگوں، جذبوں اور مناظر کی دلکش تصاویر خوبصورت تمثالوں کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ ان کے کلام میں داستانوی رموز اور استعارے ان کی غزل کے مزاج کو کلاسیکی بنا دیتے ہیں۔ یہی خوبی علی یاسر کی غزل کے اسلوب کو الگ اور منفرد کرتی ہے۔ علی یاسر کی غزل میں مکالماتی اور استفہامیہ انداز بھی ملتا ہے۔ وہ کہیں کہیں خود سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ سماج، محبوب اور مخاطب سے مکالمے کا انداز اپناتے ہیں۔ ان کا یہ انداز بہت ہی دلکش اور فنکارانہ مزاج کا حامل ہے۔ ان کے مکالماتی انداز کے پیچھے اُن کا جمالیاتی ذوق، تفکر آمیز لہجہ اور سوچنے کی صلاحیت کا عمل بھی شامل ہے۔ وہ کہیں خود کلامی کرتے ہوئے خود سے سوال کرتے ہیں۔ کہیں وہ محبوب سے استفسار اور کلام کرتے نظر آتے ہیں۔ علی یاسر کی غزل گوئی زبان و بیان کے اعتبار سے ایک ہنر ور اور فنکارانہ صلاحیتوں کے حامل تخلیق کار کی شاعری ہے۔ ان کا کلام ایک طرف فکری بالیدگی کا مظہر ہے تو دوسری طرف زبان کی لطافتوں، تشبیہات، استعارات، صنائع بدائع اور روز مرہ محاورات کے عمدہ استعمال کی بدولت بھی نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ علی یاسر نے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بطورِ محقق، مضمون نگار، مترجم اور سکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی اپنی پہچان کروائی ہے۔ علی یاسر کی تحقیقی کتب "اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا" اور "منظور عارف کے کلام کا مطالعہ اور تدوین" شامل ہیں۔ "اردو غزل میں تصورِ فنا و بقا" ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس تحقیقی کتاب میں انھوں نے تصورِ فنا و بقا کو تحقیقی روایت کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں فلسفیانہ انداز، تصوف کے موضوعات کو

خاص طور پر برتا گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے منظور عارف کے کلام کا مطالعہ بھی سنجیدہ اور محققانہ انداز میں کیا ہے۔ ان کے اس تحقیقی کام کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے منظور عارف کے کلام کو ایک ترتیب سے پیش کیا ہے اور تدوین کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا ہے۔ علی یاسر نے مختلف نوعیت کے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کے اہم مضامین میں "اردو شاعری اور شہیدِ کربلا"، "کتب راشد شناسی"، "تحقیق میں فرضیے کی اہمیت"، اور "منظور عارف کی شاعری میں سماجی طرز احساس اور ترقی پسندی" نمایاں ہیں۔ علی یاسر کا تحقیقی و تنقیدی انداز انفرادیت کا حامل ہے۔ انھوں نے سنجیدہ اور علمی انداز میں اپنے تحقیقی مضامین پیش کیے ہیں۔ ان کی علمی سنجیدگی ان کے تحقیقی و تنقیدی شعور کو واضح کرتی ہے اور الگ ادبی شناخت بھی قائم کرتی ہے۔ علی یاسر نے تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ تعارفی مضامین بھی لکھے۔ ان تعارفی مضامین میں ادبی محافل اور تنقیدی کتب کا جائزہ قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے بطور مترجم بھی اپنی پہچان بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اہم تراجم میں "چین کی محبت کی نظمیں" اور نثری تراجم میں "الیاس گھمن" اور "امرتا پریتم" کے افسانوں کے پنجابی سے اردو میں تراجم کیے۔ بطور مترجم علی یاسر نے شاعری اور فکشن کو ترجمہ کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی رہے اور اپنے آپ کو مترجم کی حیثیت سے سامنے لائے۔ تراجم میں ربط اور روانی کے سلسلے کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے پی ٹی وی کے لیے مختلف سکرپٹس لکھے۔ ان کو الفاظ کے انتخاب اور مکالمہ نگاری پر خوب دسترس حاصل تھی۔ یوں انھوں نے اپنے ادبی مرتبے اور حیثیت کو مختلف جہات میں منوایا۔ ان کی مختلف تنقیدی شناختیں، ادبی مرتبے اور انفرادیت کو سامنے لاتی ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج

علی یاسر کی ادبی جہات کا تجزیہ کرنے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ علی یاسر کی ہمہ جہت شاعری میں دنیا کی بے ثباتی، مایوسی، درد، کرب، بھوک، غربت و افلاس جیسے موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔

۲۔ علی یاسر کی شاعری فکر و فن کے اعتبار سے کلاسیکی رچاؤ اور جدت آمیز اسلوب کی حامل شاعری ہے۔

۳۔ زبان و بیان کے اعتبار سے علی یاسر کی شاعری میں روز مرہ و محاورات ، تشبیہات و استعارات ، تلمیحات، شگفتگی و نغمگی، سلاست روی اور ندرت آمیز تمثالیں فنی بالیدگی کا بھرپور تاثر قائم کرتی ہیں۔

۴۔ علی یاسر نے متفرق ادبی خدمات کے ذریعے قاری کو اردو ادب کی کئی جہات سے روشناس کروایا ہے نیز انہیں فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے جن میں تحقیقی کتب، تحقیق و تعارفی مضامین، تراجم اور سکرپٹس شامل ہیں۔

ج۔ سفارشات

اس تحقیقی مقالے میں علی یاسر کی ادبی جہات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سفارشات درج ذیل ہیں۔

۱۔ علی یاسر کا شمار معاصر شعرا میں ہوتا ہے لہٰذا معاصر شعرا کے ساتھ ان کی شاعری کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اردو رثائی ادب کو فروغ دینے میں ان کا اہم کردار ہے، ان کی رثائی شاعری پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔

۳۔ علی یاسر کی نعت گوئی کے حوالے سے تحقیقی کام نہیں ہوا۔ ان کا نعتیہ مجموعہ "ذکرِ رسول عربی" زیرِ ترتیب تھا جو ان کی وفات کے بعد شائع نہ ہو سکا۔ لہٰذا اس کو مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ علی یاسر کے علمی و ادبی مرتبے کے تعین کے لیے سیمینار منعقد ہونے چاہیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

علی یاسر، ارادہ، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷

علی یاسر، غزل بتائے گی، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۶

علی یاسر، ڈاکٹر، اردو غزل میں تصور فنا و بقاء، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۰

علی یاسر، (مرتب) کلیات منظور عارف: تحقیق و تدوین، زیر طبع

عاصم بٹ، محمد (تدوین)، چین کا ادب: عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۶

سکرپٹ (علی یاسر)، عکسی نقل مملوکہ پی ٹی وی ہوم، اسلام آباد

ثانوی مآخذ:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۱۸

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۱۵

ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر اُردو غزل کا تکنیکی، ہئیتی اور عروضی سفر، مجلس ترقی اُردو ادب، لاہور، ۲۰۰۸

امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۶

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، فروری 2015

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴

اشرف کمال، ڈاکٹر، اصطلاحات، بُک ٹائم کراچی، ۲۰۱۷

رفیع الدین اشفاق، سید، ڈاکٹر، اردو میں نعتیہ شاعری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۶

حمیدہ شاہین، مطالعہ (مضامین)، پیس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰

خلیق انجم، (مرتبہ) فن ترجمہ نگاری، ثمر آفسٹ، دہلی، ۱۹۹۴

سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اُردو میں اُصولِ تحقیق، ورڈ وژن پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۶

طارق ہاشمی، اُردو غزل- نئی تشکیل زیرو پوائنٹ پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۰۸، ص ۲۹۱

محمد حسن، پروفیسر، اردو ادب میں رومانوی تحریکیں، انجمن ترقی اردو جے۔ آر۔ آفیسٹ پرنٹر، نئی دہلی، ۱۹۹۹

مزمل حسین، ڈاکٹر، اُردو میں علم بیان اور علمِ بدیع کے مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور،

منصور خوشتر، ڈاکٹر، (مرتبہ) اکیسویں صدی میں اردو غزل، نیو پرنٹ سینٹر، نئی دہلی

لغات

فیروز اللغات اُردو جدید، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

رسائل و جرائد / اخبارات:

ادبیات (سہ ماہی) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، متعدد شمارے

ادبیات اطفال، (سہ ماہی) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷

اخبار اردو (ماہنامہ)، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، متعدد شمارے

ادبِ عالیہ (کتابی سلسلہ) فرید پبلشرز، اردو بازار کراچی، شمارہ: ۷،۶

ارقم، دارارقم ماڈل کالج راولاکوٹ، آزاد کشمیر، شمارہ: ۴، مئی ۲۰۱۴

بیاض (ماہنامہ) لاہور، متعدد شمارے

پیغامِ آشنا (سہ ماہی)، ثقافتی قونصلیٹ، سفارت اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، جلد ۱۶، شمارہ: ۶۰، سال ۲۰۱۵

پیامبر (ماہنامہ)، اسلام آباد، جلد: ۲۱، شمارہ: ۱، ۲-۳، ۵، ۷، ۲۰۱۷-۲۰۱۸

ضیائے حرم (ماہنامہ)، مئی ۲۰۰۹

دریافت (سالنامہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ: ۱۹، ۲۰۱۸

دلچسپ (ماہنامہ) غزل نمبر، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱، ۲۰۰۳

گندھار، علمی و ادبی مجلہ" ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ، ۲۰۱۶-۲۰۱۷

مدحت (سہ ماہی)، لاہور، متعدد جلدیں

نقاط، نئے ادب کا ترجمان، نقاط مطبوعات، فیصل آباد، ۲۰۲۰

انٹرویوز

حبیب حیدر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۸ نومبر ۲۰۲۰

شازیہ علی، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۱۵ ستمبر ۲۰۲۰

عمار علی یاسر، (انٹرویو) از عارفہ طاہر، اسلام آباد، ۲۵ ستمبر ۲۰۲۰

ضمائم

ڈاکٹر علی یاسر (مرحوم)

دائیں سے بائیں جانب: طارق فانی (ایڈووکیٹ)، عارفہ طاہر (مقالہ نگار)، عزہ علی یاسر (دُختر)، انا علی یاسر (دُختر)، شازیہ علی (زوجہ علی یاسر مرحوم)، عمار علی یاسر (فرزند)

JANG YOUTH FORUM, RAWALPINDI

MERIT CERTIFICATE

Name: ALI YASIR

Son / Daughter of

Event / Programme: MUSHAIRA

Position: I

College / University

INCHARGE
JANG YOUTH FORUM

MAGAZINE EDITOR
THE DAILY JANG, RAWALPINDI

JANG YOUTH FORUM, RAWALPINDI

MERIT CERTIFICATE

Name: Ali Yasir

Son / Daughter of

Event / Programme: Mushaira Jashan-i-Azadi

Position: 2nd

College / University

INCHARGE
JANG YOUTH FORUM

MAGAZINE EDITOR
THE DAILY JANG, RAWALPINDI

JAFFER BROTHERS (PRIVATE) LIMITED

Certificate of Achievement

This Certificate is presented on successful completion of

Data Entry Project at Islamabad for NADRA

(National Database and Registration Authority)

to Mr./Ms. GHULAM ALI YASIR (H.R./ADMIN. OFFICER)

S-D/o. HABIB AHMED

March 15th 2001.

Manager HR

Project Manager

فارسی از رفعت اندیشه‌ام درخورد با فطرت اندیشه‌ام (اقبال)

گواهینامه آموزش زبان فارسی

بدینوسیله گواهی میشود:

آقای علی یاسر فرزند حبیب حیدر

در آزمون دوره مقدماتی آموزش زبان فارسی سه ماهه نخست سال ۱۳۹۴ رایزنی فرهنگی جمهوری اسلامی ایران–

اسلام آباد شرکت نموده و موفق به کسب مجموع ۸۵ امتیاز گردیده است.

شهاب الدین دارائی

رایزن فرهنگی سفارت جمهوری اسلامی ایران

اسلام آباد

JAPAN-PAKISTAN FRIENDSHIP FEST

Embassy of Japan in Pakistan

in collaboration with
Pakistan Haiku Society (PHS)
& The National University of Modern Languages (NUML)

awards this certificate to

Mr. Ali Yasir
(Expert of Haiku Poetry)
for conducting

HAIKU POETRY WORKSHOP

held at NUML, H-8, Islamabad
16-18 February, 2016

Brig. Riaz Ahmed Gondal Director General (NUML)	Naseem-e-Sehar President, PHS, Islamabad	松浦純也 Junya MATSUURA Chargé d' Affaires a.i. Embassy of Japan, Islamaba

PAF releases song to celebrate Pakistan Day
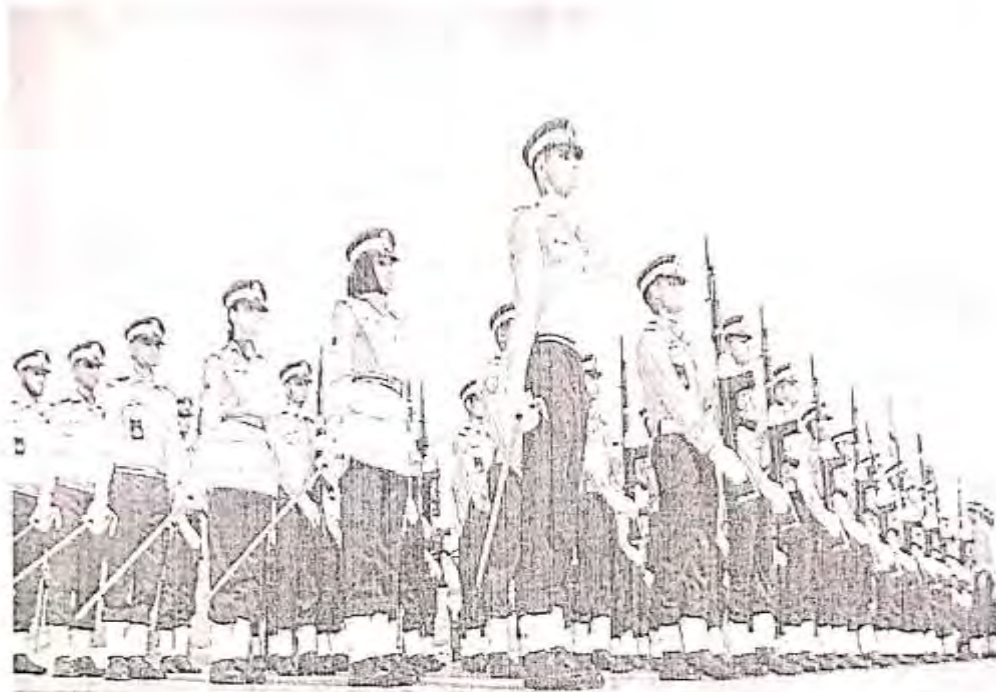
Pakistan Air Force (PAF) released a song to celebrate the Pakistan Day and to honour the innumerable services of the aerial force for the defence of the country.

The song titled 'Oonchi Uran' portrayed PAF's services to instill a riveting sense of patriotism and zeal in young minds.

Awais Niazi's vocals and Ali Yasir's lyrics were featured in the song and the music video was directed by Waqas Shahzad.

Earlier this week, songs titled 'Aman Ka Nishan Hamara Pakistan' and 'Maujon Par Qadam' were released by Inter-Services Public Relations (ISPR) and Pakistan Navy respectively to celebrate the 78th Pakistan Day.

BIO-DATA

(POET, SCHOLAR, TV ANCHOR, WRITER, TRANSLATOR)

Personal Data:

Pen Name	:	**ALI YASIR**
Full Name	:	**GHULAM ALI YASIR**
Present Job	:	Assistant Director (A&P), Pakistan Academy of Letters, H-8/1, Islamabad.
Date of Birth	:	3rd December, 1976
NIC No.	:	34101-2292505-1
Passport No.	:	AH6825052
Marital Status	:	Married.
Domicile	:	Gujranwala (Punjab)
Nationality	:	Pakistani
Address (Res.)	:	St. No. 5, Block-A, Al-Qaim Town, Khana Kak, Ibd.
Cell	:	+ 92 333-5151136
Address (Office)	:	Pakistan Academy of Letters, Patras Bukhari Road, Sector H-8/1, Islamabad.
Phone #	:	051-9269712
Fax (Office)	:	051-9269719
E-mail	:	aliyasir76@gmail.com

Academic Qualification:

1. Ph. D. Urdu Language and Literature (Thesis Submitted)
2. M. Phil, Allama Iqbal Open University, Islamabad. (2011)
3. M.A. (Urdu) University of Punjab (2003)

Computer Knowledge and Creative Activities

- Good Computer Knowledge and Typing Speed.
- Poetry & Research: Urdu, Persian, English, Punjabi

Publications

1. Irada (Poetry/Ghazlyat) 2007
2. Ghazal Bataay Gi (Poetry/Ghazlyat) 2016
3. Ehl-e-Qalam Directory (All Pakistan Writers Directory) (2008)
4. Ehl-e-Qalam Directory (All Pakistan Writers Directory) (2010)
5. Writings appeared in Pakistan's major literary magazines.
6. Translations from English and Chinese Literature

Anchoring Television/Radio:

- Hosted many TV Literary programmes and Poetry sessions.
- Hosted TV Religious and Literary Events
- Participated as Poet frequently on Pakistani TV Channels.
- Hosting Radio Pakistan Isalmabad's Literary Programme "Afkaar"
- Hosting Allamma Iqbal Open University's Radio Literary Programme "Baton se Khushboo Aay"

Translation work published

1. Chinese Love Poems (translated from English into Urdu) (2006)
2. Nobel Lecture by Najib Mahfooz (2007)
3. Punjabi Short Stories (translation from Punjabi into Urdu) 2008
4. Keats poems (translated into Urdu) 2008

Books To be Published

1. Zikr e Rasool e Arabi (Urdu Naat)
2. Be-Irada (Ghazals)
3. Chikkarr de wich Haar (Punjabi Poetry)

Writings for PTV

1. Thematic and Title Songs
2. National Songs (Presented in National Events)
3. Nominated for PTV Best Lyricist Award 2010
4. Written many Documentaries, Scripts, Live Transmissions and Literary Programmes for PTV

Participated in international event:

1. Dubai & Abu Dhabi Mushairas Nov. 2014
2. New Delhi (India), Jashn e Adab Mushaira, Nov. 2015

Interests:

Urdu, English, Punjabi, Persian Literature

Presently Serving:

- Assistant Director (Awards & Programmes)/Publication Officer BPS-17 in Pakistan Academy of Letters, Govt. of Pakistan NH&LH Division, Islamabad (From 21st April 2006 to date) Research, Administrative Events Management, Media, Books Editing & Publishing etc. are the main responsibilities. As Publication Officer Edited and published books and journals and take care of all matters regarding production and publication of different projects. Have been organizing International and National Conferences and Research Projects. Technical Person of Prime Minister Citizen Portal. Looking after the assignments of Secretary, Publication Committee and member, Purchase Committee of PAL also. Worked with Federal Secretary NH&LH Division as Resource Person for Urdu(October 2019 to January 2020) on attachment basis.

Experience:

- Assistant Director (A&P) in Pakistan Academy of Letters, H-8/1, Islamabad (From 21st April 2006 to date).
- Visiting Lecturer/Tutor of M.A Urdu Students of AIOU.
- Radio/TV Anchor
- Served as Lecturer Urdu in IMCB, F-11/3, Islamabad (Temporary basis).
- Office Secretary. In PTCL (Pakistan Telecommunication Company Limited)) (From 2nd August 2001 to Jan. 2006)
- Worked as Human Resources Officer with Jaffar Brothers Pvt. Ltd. (NADRA Project).
- Served in Punjab Employees Social Security Hospital Islamabad in Computer department. From 1998 to 2001.
- Worked as Assistant Manager (Admn.) in SABRO Air-conditioning Islamabad. 1995 to 1998.
- Worked in different Newspapers and Magazines as reporter, editor.
- Poet, Writer, Researcher and Translator.
- Attended National Mushairas of many TV channels.
- Tutor and Guest Lecturer of MA (Urdu) classes of AIOU, Islamabad.
- Has won inter-university poetry contest and many other prizes

Published Books

1. Tasawar-e-Fana o Baqa (Urdu Ghazal ke Tanazur mein), Research 2020
2. Ghazal Batay Gi (Collection of Urdu Ghazals) (2016)
3. Irada (Collection of Urdu Ghazals) (2007)
4. Ehl-e-Qalam Directory (All Pakistan Writers Directory) (2008, 2010)

Creative Writings

1. Writings appeared in Pakistan's major literary magazines.
2. Poet, TV Script, Song and Documentaries writer and Anchor.
3. National Songs written by me were presented in national events.
4. Many Documentaries, Shows and theme basis projects written for PTV.

Books under Publication

1. Kuliyat-e-Manzoor Arif (Research and Editing)
2. Natia Poetry Book
3. Collection of Ghazals & Poems

Translation work published in books and journals

1. Chinese Love Poems (translated from English into Urdu) (2006)
2. Nobel Lecture by Najib Mahfooz (2007)
3. Punjabi Short Stories (translation from Punjabi into Urdu) 2008
4. Keats poems (translated into Urdu) 2008

INTERNATIONAL REPRESENTATION

1. UAE as Poet Nov. 2014
2. India as Poet Nov. 2015
3. Muscat (Oman) as Poet/Scholar July, 2019

RESEARCH PAPERS

1. Daryaft (Y-Category of HEC) 2018
2. Paigham-e-Ashna (Z-Category of HEC) 2016
3. Noor-e-Tehqiq, 2019
4. Many Articles on Literature in Newspapers and Journals

Participation in National Conferences as Scholar

1. Lahore Garrison University, Lahore, Oct., 2019

Special interest in Fine Arts/Media

1. With experience and creativity can teach and develop extra-curricular skills of students such as poetry, singing, speech, paintings, drama, translation.
2. Can prepare Press Releases and translate for print and electronic media.

پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن لمیٹڈ

قائدِ اعظمؒ کی تقریبِ سالگرہ، 2017ء

(کنونشن سنٹر، اسلام آباد)

کمپیئرز: توثیق حیدر، مونا عالم

قومی ترانہ

تلاوتِ کلامِ الٰہی

توثیق حیدر

ہمیں فخر ہے ترے دم سے ہم کو وطن ملا، ترا شکریہ
جسے کوئی خوفِ خزاں نہیں وہ چمن ملا، ترا شکریہ

السلام علیکم خواتین و حضرات، ستاروں جیسے چمکتے اور گلابوں جیسے مہکتے پیارے پیارے بچو اور محترم ناظرین۔ پاکستان ٹیلی ویژن کی طرف سے ہم آپ سب کو بابائے قوم، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی سالگرہ کی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اس خصوصی تقریب میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ میں ہوں توثیق حیدر۔

مونا عالم

اور میں ہوں مونا عالم۔ آج قائدِ اعظمؒ کا 141 واں یومِ ولادت ہے۔ ہم سب قائد کی سالگرہ منا رہے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ نے قائدِ اعظمؒ کے حوالے سے ارشاد فرمایا تھا۔ "ہندوستان میں بحیثیت مسلمان آپ کی ہی واحد ہستی ہے جس سے ملت کو یہ توقع وابستہ کرنے کا حق ہے کہ شمال مغربی یا شاید پورے ہندوستان میں جو سیلاب آ رہا ہے اس میں آپ ملت کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے"۔

توثیق حیدر

ہماری آج کی اس Quaid-e-Azam Birthday Ceremony کا آغاز ہونہار بچوں نے ترقی ترانے اور نعتِ مصطفیٰ کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہو چکا ہے۔ قائدِ اعظم کو نوجوان نسل سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اور اسی طرح علامہ اقبال نے بھی نوجوانوں کو اپنے پیغام میں بنیادی اہمیت دی۔ آزادیِ پاکستان میں قائدِ اعظم کی بصیرت اور بلند نظری سے تاریخی کامیابی ملی۔ اقبال کا یہ شعر قائد کی شخصیت پر پورا اترتا ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مونا عالم

خواتین و حضرات! ہمیں آج قائد کے اقوال اور احکامات کے مطابق کام کام اور کام کا عہد کر کے اس پاک سرزمین کو حسین تر بنانا ہے۔ اس وقت ہم ایک ہر دل عزیز نغمے پر ہونہار اور پیارے بچوں کی پرفارمنس پیش کر رہے ہیں۔ اس خوبصورت گیت میں اپنے محسن قائد کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ تو آئیں سنتے ہیں یہ گیت اور دیکھتے ہیں یہ شاندار پرفارمنس۔

نغمہ: اے قائدِ اعظم تیرا احسان ہے احسان

توثیق حیدر

حشر تک زندہ رہے گا قائدِ اعظم کا نام

عمر بھر کرتی رہے گی خلق ان کا احترام

تحریکِ پاکستان کو ولولے، جوش، قربانی اور خلوص کے ساتھ ساتھ نئے ذہن اور نئی فکر کی ضرورت تھی۔ نوجوان اور بچے مستقبل کے امین تھے لہٰذا قائد نے ان کی ذہنی اور جذباتی تربیت فرمائی۔ انھوں نے ہمیشہ بچوں کو تعلیم پر توجہ دینے کو کہا۔ کام، کام اور بس کام کا درس دینے والے قائدِ اعظم خود بھی کام، کام اور صرف کام میں مصروف رہے۔ قائدِ اعظم تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور اخلاقی خوبیوں کو بھی اپنانے کا درس دیتے تھے۔ 30/ اکتوبر، 1947ء کو لاہور میں قائد نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا۔ ''اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو، موت سے نہ ڈرو، ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے بھی موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے''

مونا عالم

جی بالکل۔ تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان کو جب قربانیوں کی ضرورت پڑی تو بوڑھوں اور جوانوں نے ساتھ ساتھ ہمارے بچے بھی ہمیشہ تیار رہے۔ امن کے دشمنوں اور دہشت کے درندوں کے سامنے ہمارے بچوں نے بھی سینہ تان کر شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔

توثیق حیدر

قائد اعظم قوم کو روشن خیال اور جدید علوم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ پاکستان کے تمام لوگ محبت، یگانگت اور بھائی چارے سے زندگی گزاریں، یہی ان کی آرزو تھی۔ پاکستان کے سارے رنگ خوبصورت، سبھی ثقافتیں حسین اور سبھی علاقے عظمتوں سے روشن ہیں۔ اس وقت پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کی طرف سے پنجاب کے معروف فوک رقص اور جدید انداز کو پیش کیا جا رہا ہے۔ آیئے پنجاب کی اس لوک ڈانس پرفارمنس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

فوک ڈانس (پنجاب)

مونا عالم

کیوں حاضرین! بہت زبردست پرفارمنس تھی ناں۔ ہال میں بہت خوبصورت بچوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ قائد اعظم ہمیشہ بچوں کی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ 3 جولائی، 1943 کو آپ نے کوئٹہ میں فرمایا تھا۔ "علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جایئے اور علم حاصل کیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر وقت آ جائے تو ہم اپنی جان اور سب کچھ قربان کر دیں گے۔ لیکن پہلے اس کی تیاری تو کیجیے۔ ہم بے مقصد قربانی نہیں چاہتے"۔

توثیق حیدر

قائد اعظم قوم کو ایک مقصد اور منزل دینا چاہتے تھے۔ یہ مقصد اور منزل پاکستان کی صورت میں ساری دنیا نے دیکھی۔ سب لوگ حیران تھے کہ قائد نے کیسے سخت محنت اور جذبے سے ایک آزاد ریاست پاکستان کے خواب کو پورا کر دکھایا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ قیامت تک ہمارا پیارا پاکستان ہمیشہ شاد و آباد رہے گا۔

مونا عالم

اس وقت ہم ایک Instrumental Performance کی طرف چلتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں بانسری، رباب اور وائلن پر خوبصورت سُر بکھیرے جا رہے ہیں۔ آیئے انجوائے کرتے ہیں۔

Instrumental Performance

توثیق حیدر

سرسبز و شاداب، دریاؤں، پہاڑوں، جھیلوں، صحراؤں اور وادیوں کی سرزمین یہ ہمارا پیارا پاکستان انتہائی خوبصورت ہے۔ ہمارے ذہن اس کی محبت میں سوچتے ہیں اور ہمارے دل اس ارضِ وطن کے احساس میں دھڑکتے ہیں۔ پاکستان کے سب علاقے کی ثقافت اور تہذیب انتہائی خوبصورت ہے۔ سندھ قائد کی سرزمین، سندھ اولیا کی سرزمین، سندھ وسیع صحراؤں اور محبت کے گیتوں کی دھرتی ہے۔ سندھ بابِ اسلام اور عروجِ دوام کی حامل دھرتی ہے۔

مونا عالم

اس وقت ہم سندھ کے فوک ڈانس پر مشتمل ایک پرفارمنس کے لیے پی این سی اے کے گروپ کو دعوت دے رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح سندھ کے وسیع و عریض خطے کی فوک ریت کو رقص کی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ آئیں دیکھتے ہیں سندھ کا فوک ڈانس۔

فوک ڈانس، سندھ

توثیق حیدر

وادیٔ مہران کی نمائندگی کرتی ہوئی یہ خوبصورت پرفارمنس یقیناً بہت خاص تھی۔ مجھے قائد کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل گیارہ برس کی ایک بچی نے قائدِ اعظم کو ایک رومال پر پاکستان کا نقشہ کاڑھ کر بھیجا۔ قائد کو اس تحفے پر بہت خوشی ہوئی اور انھوں نے یہ رومال وائسرائے کو دکھایا اور کہا کہ پاکستان کو اب کون روک سکتا ہے؟۔ تو یہ تھا ہمارے قائد کا یقین اور ویژن۔ ہمیں اقبال کے کلام اور قائد کے پیغام سے ہر میدان میں کامیابی مل سکتی ہے۔

مونا عالم

ناظرین! قیامِ پاکستان سے پہلے کا زمانہ مسلمانوں کے لیے بے حد مشکل اور پریشان کن تھا۔ اسلام اور پاکستان کے دشمن آزادی کی جدوجہد اور پاکستان کی راہ میں حائل تھے۔ قائدِ اعظم کی قیادت میں مسلمان اور پاکستان سے محبت رکھنے والے سب لوگ یکجا ہوئے۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے کی گونج فضا میں بلند ہوئی۔ آزادی کی مسرتوں اور خوشیوں کو لٹے پٹے مہاجروں اور پسماندہ پاکستانیوں نے شکر کے ساتھ منایا۔ آزادی کے فوری بعد پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک ہمیں بہت سی مشکلات اور چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ قائدِ اعظم اور ان کے رفقاء نے تمام چیلنجز کو قبول کیا اور دنیا پر ثابت کیا کہ پاکستان ہمیشہ زندہ، سلامت اور باوقار ملک کی حیثیت سے رہے گا۔ ہم بھی اپنے قائد کی اس امانت کو جان سے عزیز رکھیں گے۔

توثیق حیدر

بابائے قوم ہماری ملت کے پاسبان ہیں۔ کئی برس قبل مسعود رانا کی آواز میں ایک نغمہ پاکستان بھی [illegible]
مقبول ہے۔ آیئے اس وقت اسی مشہور نغمے پر بچوں کی ایک خوبصورت پرفارمنس دیکھتے ہیں۔ آپ کی بھرپور تالیوں میں آ رہے ہیں
اسکولوں کے بچے۔

نغمہ: ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح

مونا عالم

اس نغمے میں قائد سے محبتوں کا بے مثال اظہار کیا گیا۔ یقیناً ہمارا ہر لمحہ قائد سے عقیدت اور وابستگی میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔ قائد
کا نام اور یہ وطن ہمیشہ سلامت اور شاداب رہے گا اور ہم سب اس کی خدمت میں مصروف رہیں گے۔

توثیق حیدر

آج قائد کے ساتھ ساتھ ہم سب اور خصوصاً مسیحی برادری حضرت عیسیٰ کے یوم ولادت کی خوشیاں بھی منا رہی ہے۔ قائد کے
پاکستان میں سب کو برابر کے حقوق اور محبت حاصل ہے۔ قائد نے ہمیشہ ہر مذہب کے پاکستانیوں کو امن اور شہری حقوق کا برابر مستحق قرار
دیا۔ 14 جولائی، 1947ء کو قائداعظم نے فرمایا تھا۔ "پاکستان میں اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی خواہ وہ کسی فرقے سے
تعلق رکھتی ہوں۔ ان کا مذہب، عقیدہ اور ایمان پاکستان میں بالکل سلامت اور محفوظ رہے گا۔ ان کی عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی
مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کے مذہب، عقیدے، جان و مال اور ان کی ثقافت کا مناسب تحفظ ہوگا۔ وہ بلا لحاظ رنگ و نسل ہر اعتبار سے
پاکستان کے شہری ہوں گے"۔

مونا عالم

خواتین و حضرات! ہم ان شرپسند اور امن دشمن طاقتوں کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہر پاکستانی اس مادرِ وطن پر نچھاور ہونے کے لیے ہر
وقت تیار ہے۔ وطن سے محبت ہمارا ایمان ہے۔ اقلیتی برادری کی شہادتیں اور قربانیاں بھی پاکستان کے دشمنوں کے عزائم خاک میں ملانے
کے لیے ایک مثال ہیں۔ ہم سب ایک ہیں کیونکہ ہمارا وطن اور قائد ایک ہے۔

توثیق حیدر

غیور بلوچوں کی سرزمین وسعت، غیرت، محبت، امن دوستی اور وطن پرستی میں بے مثال ہے۔ اس کے ریگستانوں میں موتی رقص
کرتے ہیں اور اس کی ہوائیں گنگناتی ہیں۔ آیئے اس وقت بلوچستان کے فوک رقص پر ایک خوبصورت پرفارمنس دیکھتے ہیں۔ وطن
سے محبت کا یہ انداز یقیناً آپ کو بہت پسند آئے گا۔ فوک ڈانس۔ بلوچستان

مونا عالم

ہم نے یہ انتہائی خوبصورت پرفارمنس بہت انجوائے کی۔ بلوچستان کا لوک رقص بہت دلکش ہے۔ خواتین و حضرات، قیامِ پاکستان کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اقبال کے تصورِ آزادی نے قائدِ اعظم کی ہمت کو روشنی بخشی۔ ہم جو یہاں کھڑے ہیں یہ سب پاکستان کی بدولت ہیں۔ یہی وطن ہماری پہچان ہے، یہی ہماری جان ہے اور یہی ہماری شان ہے۔ سبز ہلالی پرچم کے سامنے ہم سب ایک جان، ایک آواز ہیں۔

توثیق حیدر

یہاں آج بچوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ اقبال کی طرح قائدِ اعظم کو بھی اپنی قوم کے بچوں سے بہت محبت اور امیدیں تھیں۔ ان کی نظریں آنے والے پاکستان کے لیے خوشحالی کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ بچوں کی صورت میں مستقبل کے معمار اور قائد نظر آرہے تھے۔ قائد نے ہمیشہ بچوں کو شفقت اور رہنمائی دی۔ بچوں اور نوجوانوں کو بھی قائد کی فکر اور پیغام کو سمجھنا ہے۔ آج ہمیں روحِ قائد سے وطن کی حفاظت اور ترقی کا وعدہ پھر سے کرنا ہے۔

مونا عالم

اس وقت آپ کی خدمت میں بچوں کی طرف سے اپنے قائد سے وفا و ایثار کے عہد پر مشتمل ایک پرفارمنس پیش کی جارہی ہے۔ میں اس پرفارمنس کے لیے اسکولوں کے بچوں کو یہاں آنے کی دعوت دیتی ہوں۔ اے روحِ قائد آج کے دن ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں۔

نغمہ: اے روحِ قائد آج کے دن

توثیق حیدر

بہت مزہ آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کو کامیاب پاکستانی بنائے اور وطن کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔ بے شک ہمارا آنے والا دور خوش حالی، ترقی اور عظمت کا زمانہ ہوگا۔ ہمیں انفرادی و اجتماعی طور پر وطن کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

مونا عالم

توثیق! ہم نے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے لوک رقص پر تو پرفارمنس دیکھی اور بہت مزہ بھی آیا۔ تو کیوں نا اس وقت ہم خیبر پختونخوا کی فوک ڈانس پرفارمنس سے بھی لطف اٹھائیں؟

توثیق حیدر

جی بالکل، ٹیم [illegible] [illegible]

اندوز ہوتے ہیں۔

فوک ڈانس، کے پی کے

مونا عالم

بہت شکریہ۔ بہت ہی زبردست پرفارمنس پیش کی گئی۔ توثیق! قائدِ اعظم آخری عمر تک قوم کے بچوں سے بہت قریب رہے [illegible] کے آئندہ زمانوں کے پاکستان کے وقار اور سربلندی کے خوابوں کی تعبیر بچوں سے وابستہ تھی۔ آپ وہ ولی [illegible] ہیں۔

توثیق حیدر

جی بالکل۔ فولادی ارادے والے دنیا کے عظیم ترین سیاست دان بچوں کے لیے ریشم سے بھی زیادہ نرم تھے۔ ایک بار [illegible] لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ آپ کھلونوں کی دکان کے سامنے اپنی کار سے اترے۔ قائد کی جاذبِ نظر اور دلکش شخصیت کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ لوگ حیران تھے کہ قائد کھلونوں کی دکان پر کیونکر پہنچے ہیں لیکن کروڑوں مسلمانوں کے قائد بچوں کے لیے شفیق بابا بھی تھے۔ اصل میں وہ کوئٹہ میں جس خاندان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اس گھر کا ایک چھوٹا سا بچہ ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا اور انھیں دادا کہہ کر پکارتا تھا۔ ماں کے منع کرنے کے باوجود وہ دادا کے کمرے میں اکثر آ جاتا اور قائد اس سے اپنے [illegible] پیاری باتیں کرتے اور اس کے ساتھ کھیلتے۔ بے پناہ مصروفیت میں سے وقت نکال کر وہ کھلونوں کی دکان پر اسی بچے کے لیے ایک کھلونا خریدنے گئے تھے۔ بچے ان کی نظر میں مستقبل کے معمار تھے۔ قوم کی آئندہ امیدیں بچوں کی صورت میں چمکتی تھیں۔

مونا عالم

تیرے افکار کے انوار سے ہوں گے روشن
جیسے آزاد ہوئے تھے تری تدبیر سے ہم

یقیناً قائد کا پاکستان ہر گام ترقی کی اگلی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اللہ کے کرم سے آنے والا وقت بھی اس پاک سرزمین کی کامیابیوں کا شاہد ہو گا۔ ہمیں اور ہمارے بچوں نے ہی پاکستان کو قائد کے خوابوں کا ترجمان ترقی یافتہ اور باوقار ملک بنانا ہے۔ آیئے اس وقت پی این سی اے کی ٹیم کو بلاتے ہیں جو آج کی آخری پرفارمنس ایک نغمے پر پیش کر رہی ہے۔ نغمہ ہے پاکستان بنانا ہے۔

پاکستان بنانا ہے، پی این سی اے پرفارمنس

توثیق حیدر

بہت خوب۔ بہت لطف آیا۔ قائد اعظم اور اقبال سب پاکستانیوں میں یہ خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے وہ کہتے تھے کہ۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مونا عالم

قائد کی سالگرہ کی اس خصوصی تقریب میں اب ہم اپنے ہردلعزیز قائد کی سالگرہ کا کیک کاٹیں گے۔ میں معزز مہمان خصوصی کی خدمت میں درخواست کرتی ہوں کہ اسٹیج پر تشریف لائیں اور قائد کی سالگرہ کا کیک بھی کاٹیں اور اس کے بعد اس مناسبت سے اپنے خیالات کا اظہار بھی فرمائیں۔ آئیں بانی پاکستان کی سالگرہ کا جشن منائیں اور ہم آواز ہو کر ہم سب اپنے قائد کو سلام پیش کریں۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو قائد اعظم۔ تقریر مہمان خصوصی

توثیق حیدر

موجودہ دور میں قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی بہت ضرورت ہے۔ آج ہمیں قائد اعظم کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے قیام کے مقاصد کو بھی عملی جامہ پہنانا ہے۔ زندہ قومیں اپنے قائد اور ہیروز کو یاد رکھتی ہیں، اور یہ محبت صرف قومی دنوں کی مناسبت سے ہی نہیں بلکہ ہر لمحہ ہونی چاہیے۔ ہمارے نوجوانوں میں بے پناہ ٹیلنٹ اور صلاحیتیں ہیں، ہم یقیناً عالمی سطح پر کسی بھی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ قائد اعظم کو نوجوانوں سے بہت امیدیں تھیں۔ ہمارا مستقبل اپنے ماضی سے مربوط ہے اور حب الوطنی کے جذبے کو عام کرنے کے لیے ہمیں قائد کے اقوال سے رہنمائی لینا ہوگی۔ ہمیں اپنے ملک سے بے پناہ محبت ہے اور یقیناً یہی ہمارا سرمایہ ہے۔ علامہ اقبال کا یہ خوبصورت شعر روشن مستقبل اور آنے والے خوشحال کل کی بشارت کے حوالے سے پیش ہے۔

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

مونا عالم

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہمیشہ ہمارے وطن کو سلامت رکھے اور ہمیں قائد سے محبت کا حق ادا کرنے کی توفیق دے آمین۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اللہ حامی و ناصر۔ قائد اعظم زندہ باد، پاکستان پائندہ باد

تحریر و تحقیق۔ علی یاسر
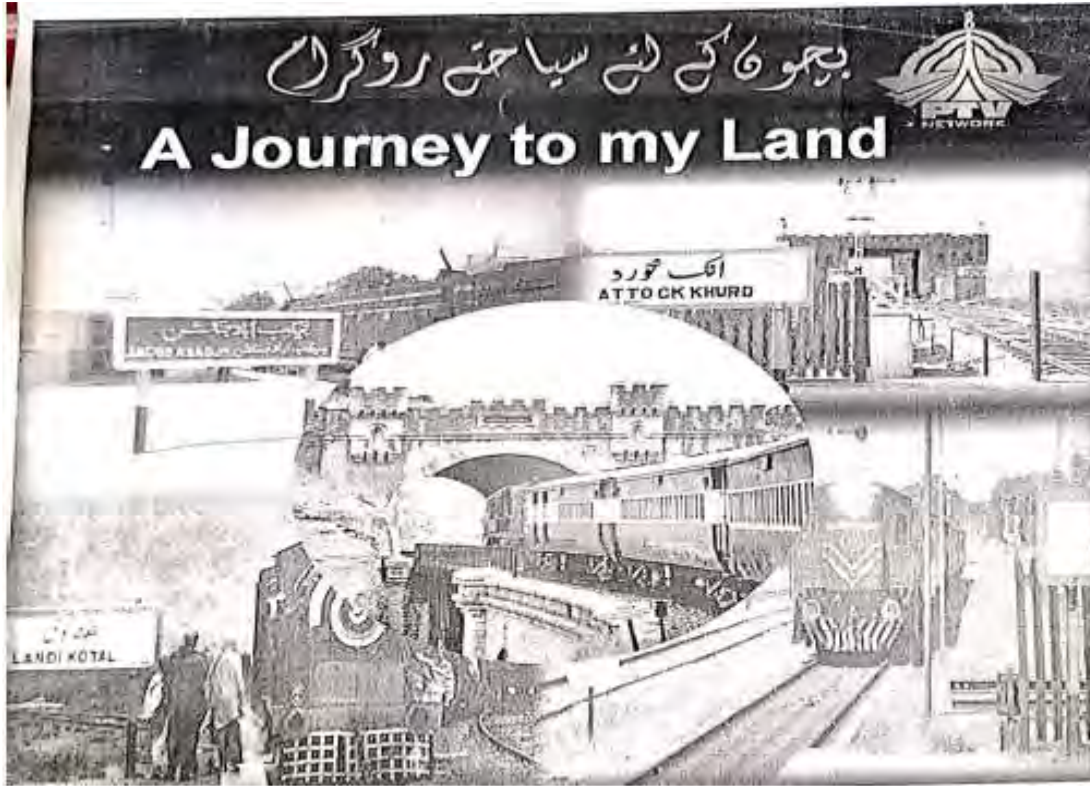
بچوں کے لئے معلوماتی
سیاحتی پروگرام

A Journey to my Land

A Journey to my Land	ٹائٹل
بچوں کے لئے دلچسپ معلوماتی سیاحتی پروگرام	فارمیٹ
نوجوان، بچے	ٹارگٹ آئیڈنس
سہ ماہی (تیرہ اقساط)	اقساط
اردو	زبان
25 منٹ	دورانیہ
سہیل اشرف	پروڈیوسر
پی ٹی وی ہوم اسلام آباد	پیشکش

ون الائنر

ریل کا سفر زندگی کے یادگار تجربات میں سے ایک ہے۔ یہ یقیناً ایک الگ ہی سحر انگیز طلسم سے بھری دنیا کی کہانی ہے۔ پلیٹ فارم سے لے کر اپنے مطلوبہ ریلوے اسٹیشن تک سفر مکمل ہونے تک انسانی سوچ بھی سفر کی بہت سی منازل طے کرتی ہے۔ یہ سفر ایک نہ بھولنے والا یادگار رومانس ہی نہیں زندگی کی حقیقت کے انمٹ نقوش بھی چھوڑتا ہے۔

پاکستان ریلوے کی اپنی ایک تاریخی حیثیت ہے پاکستان میں ریلوے اسٹیشن کے ساتھ ساتھ بسنے والے پورے ملک کے شہر، قصبے اور گاؤں ایک اپنی الگ ہی ثقافت کے رنگ رکھتے ہیں اور یہ سارے رنگ مل کر ہی پاکستان بناتے ہیں۔ پنجاب، سندھ کے میدانی علاقے ہوں یا بلوچستان خیبر پختون خواہ کے سنگلاخ پہاڑ، کشمیر کی وادیاں ہوں یا گلگت بلتستان کے برف پوش پہاڑ بھی اپنے اندر خوبصورت پاکستانی ثقافت کے رنگ سموئے ہوئے ہے۔ پاکستان ریلوے کی تاریخ اور پاکستانی علاقوں کی خوبصورت ثقافت کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے پی ٹی وی ہوم کی اسکرین سے ایک پروگرام پیش کیا جائے گا جس میں پاکستان ریلوے میں سفر کرتے ہوئے اس کے ٹریک کے ساتھ بسنے والے خوبصورت شہروں کے بارے میں مکمل تحقیق کے بعد اسی شہر میں قیام کرتے ہوئے اس شہر اور اس کے باسیوں وہاں کی مشہور ماضی اور حال کی شخصیات کے بارے میں معلومات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے گا۔

اس پروگرام کے ذریعے پی ٹی وی ہوم کے دنیا بھر کے ناظرین کو دلچسپ معلوماتی انداز میں پاکستان کی سیاحت کو فروغ دیتے ہوئے ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ وہ علاقے جو اپنے دامن میں پاکستان کی ثقافت کے مختلف رنگ سمیٹے ہوئے ہیں وہاں کے لوک رنگوں کو پی ٹی وی کے کینوس سے دنیا بھر کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس پروگرام میں ریلوے اسٹیشن سے ریلوے اسٹیشن تک کا سفر پاکستان ریلوے سے کرتے ہوئے نہ صرف اپنے کرداروں کی زبان سے اس سفر کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے گا جس شہر یا قصبہ میں قیام کیا جائے گا وہاں کے لوک فنکاروں، لوک روایات، لوک کہانیوں یا وہاں کے مقامی کسی بھی دلچسپ کردار کو بھی اس پروگرام کا حصہ بنایا جائے گا۔

پروگرام کے ثمرات:

پی ٹی وی ہوم کے اس پروگرام سے نہ صرف پاکستان میں سیاحت کو فروغ حاصل ہوگا۔ پاکستان ریلوے کی تاریخ سے بھی آگاہی حاصل ہوگی بلکہ اس کی بدولت پاکستان کا وہ ثقافتی ورثہ جو پاکستانی عوام کی نظروں سے اوجھل ہے پاکستان کی ثقافت کے وہ رنگ جن کی بدولت ان علاقوں کی پہچان ہے وہ لوک روایات، وہ لوک کہانیاں وہ لوک رس، لوک ورثہ، لوک رنگ ان سب کو ایک خوبصورت انداز میں پاکستان بلکہ دنیا کے سامنے لایا جا سکتا ہے جن سے ان علاقوں کی معاشی سرگرمیوں میں بھی فعالیت لائی جا سکتی ہے۔ اس پروگرام کی وساطت سے بچوں خصوصاً نوجوانوں میں اپنے وطن سے محبت کے جذبات کو مہمیز دی جا سکتی ہے۔

پروگرام کے سیشنز

پروگرام کا آغاز	اس پروگرام کے لئے خصوصی طور پر سفر کے لئے پاکستان ریلوے کی خدمات حاصل کی جائیں گی سفر کا آغاز ٹیم پروگرام کی ٹیم کے ساتھ اسلام آباد ریلوے اسٹیشن سے کیا جائے گا۔
دوران سفر	ریلوے کے سفر کو دلچسپ بنانے کے لئے سفر کے دوران آنے والے اسٹیشن کے بارے میں معلومات کو پروگرام کا حصہ بنایا جائے گا۔ جن اسٹیشن پر گاڑی کے اسٹاپ کا دورانیہ زیادہ ہو گا وہاں کامیڈی اداکاروں سے اسٹیشن پر مسافروں کے ساتھ گپ شپ کو پروگرام کا حصہ بنایا جائے گا۔
سفر کا اختتام اور متعلقہ علاقے میں قیام	اپنے مطلوبہ اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہاں قیام کیا جائے گا۔
علاقے کی شخصیات سے ملاقات اور لوک ورثہ	بالفرض اگر ہمارا مطلوبہ اسٹیشن "منڈی کوٹل" ہے تو وہاں کی ماضی اور حال کی شخصیات کے بارے میں ایک رپورٹ اس کے علاوہ وہاں کی لوک روایات ،لوک کہانیاں ،لوک ورثہ ،لوک موسیقی کے علاوہ وہاں کے مقامی فنکاروں کے کام کو بھی پروگرام کا حصہ بنایا جائے گا۔
اختتام	پروگرام کے اختتام پر پروگرام کی ٹیم کو اسٹیشن سے اگلے مطلوبہ اسٹیشن کے لئے روانہ ہوتے دکھایا جائے گا۔

پروگرام کی شخصیات

میزبان	ہائی اسکول لیول کے میزبان طالب علم اور طالبہ
بچے	مختلف عمر کے بچوں کا ایک گروپ
کامیڈی اداکار	پروگرام کی دلچسپی برقرار رکھنے کے ایک یا دو کامیڈی اداکار
لوک فنکار	جس علاقہ کا انتخاب کیا جائیگا وہاں کے لوک رنگوں لوک کہانیوں ،لوک روایات کو پیش کرتے ہوئے مختلف مقامی فنکار

TRANSLATION OF URDU POEMS OF ALI YASIR

(10 POEMS)

GO BACK FEBRUARY

Go Back February

Last year

You had put many blocks of snow

On my senses

A cruel thunder

like a stance

You had poured

In the silk of my eyes

Go Back February

You didn't announce springs

You didn't charm flowers

Go Back........

You had came to demolish my life

Came to desolate my city of dreams

Came to make senseless my emotions

Go Back February

QUICK DECISION

Tomorrow you can need us

In hour of trouble

Don't make quick decision

Of separation

It can be long

After you

Loneliness will be my friend

My life is passing

Only with your memories

MEN & WOMEN

Both of you awarded with a quality

Men are for love

And

Women are for beauty

Man praised woman

And

Woman gave love

And

Man lost all with her one sight

MEMORIES

When you came to meet me

Weather became quite pleasant

The songs echoed

Eyes became dreamful

And today

Your memories

Shed tears from my eyes

And raining from clouds

AFRAID

The silence of night

The cluster of stars

The yellow moon

Make me afraid

But

I look into my heart

Watch your picture

And

Be happy

CRAZY LIFE

Crazy life

Passed with much troubles

It took

Many blind turns

It didn't take a breath

It didn't get any joy

Didn't beg from anyone

But believed on myself

BEAUTY OF MOUNTAINS

The mountains are full of beauty

Worth spending the whole life there

I would listen

To the song of beauty fountain

If I devote my life there

To be near to God

You must perch

On the mountains

HAZY PROMISE

It was a grey evening

Desire of love was at peak

The shivering hands were in hands

With wet eyes, lips

And low tune

Some words were uttered

Which were heard by all scenes

The evening was grey

A promise was committed by someone

Think.......

Was it you or me?

LABOUR

From dawn to night

I have to work

I have to cool down

Different kinds of people

Who does turn ears

To the wishes of heart

Then I become able

To survive

STONE

I was a stone

A stone was my heart

A stone

Which beat and moved

Someone's flaming touch

Melted this stone

With its heat

In such a way

That the nature of stone

Cooled as dew-drops

After exploring the rock of myself

Dug out many streams

Acquiring self consciousness

Stage by stage

Whichever stone I touch

It melts

ترانہ آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور، اسلام آباد

علی یاسر

روشن مستقبل کی ضمانت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور
بانٹ رہا ہے علم کی دولت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور

ہمدردی اور پیار سے ہر اک سبق پڑھایا جاتا ہے
کوئی بھول نہیں سکتا ایسے سمجھایا جاتا ہے
اعلیٰ تعلیم و تربیت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور

فن و ہنر کی ماہر بچیاں پاتی ہیں اسلوب یہاں
تخلیقی جوہر کی حوصلہ افزائی ہے خوب یہاں
محنت کو دیتا ہے عظمت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور

آرائش اور حُسن و خوبی کا پرچار کیا جاتا ہے
علم و عمل، احساس کے جذبے سے سرشار کیا جاتا ہے
حُرمت، عصمت، قسمت، زینت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور

علم کی سچی طاقت سے ہر اک بچی کو نکھرنا ہے
آنے والے دور کی ہر مشکل کا سامنا کرنا ہے
سکھلاتا ہے طورِ قیادت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور

روشن مستقبل کی ضمانت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور
بانٹ رہا ہے علم کی دولت آئی ایم سی جی آئی ایٹ فور

نذرِ رومیؒ

مریدِ شمس تبریزی جلالِ دین زندہ باد
زمانے میں تری بے مثل ہے تحسین زندہ باد
ترے افکار کے انوار کا آئین زندہ باد
ترے دم سے ہوا اقبال کا شاہین زندہ باد

عجب آزادگی پائی محبت کے اسیروں نے
تجھے مرشد بنایا ہے زمانے کے فقیروں نے
ترے ہر حرف کو چوما ذہانت خیز ہیروں نے
تجھے دل میں بسایا ہے سدا دل کے امیروں نے

تصوف ہے ترا پیکر، زباں ہے شاعری تیری
جہاں پر راج کرتی ہے غزل اور مثنوی تیری
فضائے دانش و عرفان میں ہے برتری تیری
چلی ہے حبسِ ظلمت میں ہوائے روشنی تیری

محبت کا سبق اک مولوی تعلیم کرتا ہے
ہر اک اپنا پرایا با ادب، تعظیم کرتا ہے
مفکر ہر علاقے کا اسے تسلیم کرتا ہے
شعور و آگہی اس کا ہنر تقسیم کرتا ہے

جہانِ دانش و فہم و فراست کا سفینہ تُو
جنوں کو بخش دیتا ہے توازن کا قرینہ تُو
کہیں سب پیرِ رومی ہے محبت کا خزینہ تُو
خدا کا بندہ ہے اور عاشقِ شاہِ مدینہ تُو

زمانے میں مثالی ابتدا و انتہا تیری
نرالی خطۂ روحانیت میں ہے ادا تیری
دلوں میں ہے ہمارے عشق تیرا اور وِلا تیری
ہمارے کاسۂ فکر و ہنر میں ہے عطا تیری

علی یاسر

یہ پرچم پاک وطن کا، یہ پرچم پاک وطن کا
سینے پہ سجایا ہے پرچم
آنکھوں میں بسایا ہے پرچم
ہونٹوں سے لگایا ہے پرچم
تعویذ بنایا ہے پرچم
یہ پرچم پاک وطن کا، یہ پرچم پاک وطن کا
سب عزم سفر کے ہیں قائل
ہم نے پائی ہر اک منزل
ہے رشکِ زمانہ حال اپنا
اور روشن تر ہے مستقبل
اللہ کے نام پہ دیس بنا، رحمت کا سایا ہے پرچم
یہ پرچم پاک وطن کا، یہ پرچم پاک وطن کا
پُر جوش جوانوں نے مل کر
اس دیس کو خوب سنوارا ہے
دنیا کی مثالی قوموں میں
اب اونچا نام ہمارا ہے
ہم جس میدان میں جاتے ہیں اوپر ہی اٹھایا ہے پرچم
یہ پرچم پاک وطن کا، یہ پرچم پاک وطن کا
اخلاص ہماری فطرت ہے
یہ ملکِ امن و محبت ہے
ہے ستر سال سفر اس کا
اللہ کی رحمت، برکت ہے
جو پرچم چوم کے عہد کیا، وہ عہد نبھایا ہے، پرچم
یہ پرچم پاک وطن کا، یہ پرچم پاک وطن کا
دن مہکے روشن ہیں راتیں
خوشیوں کی ملی ہیں سوغاتیں
ہے قدر اقوامِ عالم میں
ہر سُو ہیں ترقی کی باتیں
صد شکر کریں، صد فخر کریں، ہر جا لہرایا ہے پرچم
یہ پرچم پاک وطن کا، یہ پرچم پاک وطن کا

پنجابی نعت

علی یاسرؔ

چار چوفیرے کفر دی گھمن گھیری ہووے
جے سرکارؐ نہ ہوون دنیا نھیری ہووے

اونہاںؐ دا جے رحم ناں ہووے دنیا اُتے
نفسا نفسی، بدی تے ہیرا پھیری ہووے

جنیا ورھیاں دا وی اوکھا ہووے پینڈا
جے سرکارؐ بلان ذرا ناں دیری ہووے

کوئی کم ناں ہووے، کوئی غم ناں ہووے
ساہڈے پلّے اِک غلامی تیریؐ ہووے

مر کے وی ناں مریئے اوتھے سجدے کریئے
جے سرکارؐ دے لاگے ساہڈی ڈھیری ہووے

یاسرؔ حشر دیہاڑے میں ایہہ چاہناں واں
اوہناں دے صدقے وچ بخشش میری ہووے

پنجابی نعت (اختر شیخ): منظوم ترجمہ: علی یاسر

جسے لفظ خدا کے یاد تھے، فرمان اس کا قرآن

دل اس کا انائیں بانٹتا اور سب سے اونچی شان

وہ آنکھ کھلی تو صبحِ نو سے روشن ہوگیا شہر

تھیں کرنیں مہرِ علم کی جیسے لہروں پر لہر

دیا خیر خزینہ دہر کو، بخشی مجھ کو خیرات

سچ سینے سنگ لگالیا یہ سب سے بڑی سوغات

فصل ایسی بوئی نُور کی صحرا کو کیا پُرنُور

دیکھا پھر ایک جہان نے جب ریت کو لاگا بُور

دنیا ساری حیران تھی، دِیا ایک ایسا دستور

اک جیسے اس کے شہر میں، کیا شاہ اور کیا مزدور

حسن کی بے رحم ملکہ

جان کیٹس کی نظم (La Belle Dame Sans Merci) کا منظوم ترجمہ

مترجم: علی یاسر

سن اے مردِ جری تجھ کو یہ کیسا روگ کھائے جا رہا ہے
لئے یہ زرد چہرہ کیوں اکیلا پھرتا رہتا ہے؟
اگرچہ جھیل کے پہلو کا سبزہ سربسر مرجھا چکا ہے
کوئی بھی خوش نوا طائر نہیں ہے محوِ نغمہ

سن اے مردِ جری تجھ کو یہ کیسا روگ کھائے جا رہا ہے
بتا چہرہ ترا اترا ہوا اور غمزدہ کیوں ہے؟
گلہری کر چکی ہے گیہوں کا وافر ذخیرہ بھی
کٹائی ہو چکی ہے فصل کی بھی

جبیں تیری گلِ ابیض ہوئی جاتی ہے کیونکر
اذیت کی نمی کی بوندیں اس پر کھیلتی ہیں
ترے رخسار ہیں یا پھول مرجھائے ہوئے ہیں
ہے جاری رنج و محرومی کا اک سیلِ سبک رو

وہ یوں بولا ۔۔۔۔
مہکتے مرغزاروں میں ملا تھا اک حسینہ سے
وہ تھی ایسی کہ جیسے ہو پری زاد
گھنی، لمبی تھیں اس کی زلفیں اور پاؤں گداز انداز
عجب آنکھیں تھیں اس کی جن میں وحشت جاگتی تھی

بنایا میں نے خود اس کے لئے اک تاج پھولوں کا
کمر بند اور گجرے بھی کئی خوش رنگ پھولوں سے
مجھے وہ دیکھتی وارفتگی سے اور محبت سے
تو ٹھنڈی آہیں بھرتی تھی

اسے لے کر میں رہوار سبک پر سیر کو نکلا
نظر تھی محو اس کے حسنِ ساحر میں فقط دیکھا نہ کچھ بھی اور

ہوا کے دوش پر لہراتی جاتی گاتی جاتی
گیت شیریں اور اچھوتا ماورائی

وہ لائی ڈھونڈ کر میرے لئے خوش ذائقہ بیلیں
وہ جنگلی شہد لائی اور من و سلویٰ سوغاتیں
مجھے اس بات پر کامل یقیں ہے اجنبی الفاظ میں اس نے کہا مجھ سے
"مجھے تم سے بہت سچی بہت خالص محبت ہے"

مجھے وہ ساتھ لے کر پریوں والے غار میں پہنچی
اچانک ہو گئی مصروف وہ آہ و بکا میں، درد سے لبریز آہیں تھیں
وہاں میں نے پھر اس کی چشم گریہ کو
کیا تھا خشک اپنے چار بوسوں سے

مجھے آغوش میں لے کے رسیلا گیت گاتی جا رہی تھی اور ادھر میں سو رہا تھا
میں پہنچا نیند کی وادی میں تو پھر اک بھیانک خواب میرا منتظر تھا
وہ میرا آخری خواب۔۔۔۔ آہ
یہیں پر بر لب کہسار سرد و بے مروّت

وہاں پر میں نے دیکھے زرد چہرے بادشاہوں، شاہزادوں کے
وہ سارے جنگجو پہنے ہوئے تھے موت کی زردی
سبھی چلا رہے تھے، چیختے تھے۔۔۔۔ حسن کی بے رحم ملکہ
بہت افسوس ہے تم بھی اسی کے سحر قاتل میں گرفتار و شکستہ ہو

لبوں پہ ان کے فاقے تھے منقش، تیرگی میں بھی نظر آتے
وحشیانہ خوف سے پورے کھلے تھے ہونٹ ان کے اور میں حیراں
ہوا بیدار جب تو میں نے خود کو اس جگہ پایا
یہیں پر بر لب کہسار سرد و بے مروّت

قیام عارضی میرا اسی جا ہے بس
لئے یہ زرد چہرہ میں اکیلا پھرتا رہتا ہوں
اگرچہ جھیل کے پہلو کا سبزہ سر بسر مرجھا چکا ہے
کوئی بھی خوش نوا طائر نہیں ہے محو نغمہ

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ

"غزل بتائے گی"

جدید لہجے کے شاعر علی یاسر
کی شعری تصنیف کا جائزہ